# ساحری، شاہی، صاحب قرانی

## داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ

جلد دوم: عملی مباحث

شمس الرحمٰن فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ

جلد دوم

الٰہی غنچۂ امید بکشا

# ساحری، شاہی، صاحب قرانی

داستان امیر حمزہ کا مطالعہ

جلد دوم

عملی مباحث

## شمس الرحمٰن فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

**Sahiri, Shahi, Sahib Qirani:**
**Dastan-e-Amir Hamza Ka Muta'la Vol.II (Amli Mubahis)**
*by*
**Prof. Shamsur Rahman Faruqi**



پہلا ایڈیشن : 550
سنہ اشاعت : 2006

سلسلۂ مطبوعات : 1265

ISBN:81-7587-185-7 (set)
81-7587-186-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی-006 110

# پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کررار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

آل احمد سرور (۱۹۱۱ تا ۲۰۰۲)

کی یاد کو خراج عقیدت کے طور پر،

جن کے اس ایک جملے کو داستان کی تمام تنقید کی بنیاد قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا:

"ہمارے یہاں ناول سے پہلے داستانوں کا ایک شاندار سرمایہ ہے جس کی عظمت کا اعتراف ضروری ہے مگر جو ناول سے بالکل مختلف فن سے تعلق رکھتا ہے۔"

آل احمد سرور: "فکشن کیا، کیوں، اور کیسے؟"

مطبوعہ "شب خون"، شمارہ ۲۷، مئی ۱۹۷۲

# فہرست مطالب

صحرا گرمی ست در دل تنگ
دریا
عرقی
ست
چکیدہ
از
سنگ
لختی بدر آ ز عالم ننگ
یعنی کہ ز کارگاہ نیرنگ
ہر نقش کہ دیدی آں قدر نیست

(میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی، در "نکات بیدل"، نکتہ ۱۰)

## دیباچہ جلد دوم

"ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ" کی پہلی جلد (۱۹۹۹) میں "عرض مصنف" کے تحت میں نے لکھا تھا کہ "داستان امیر حمزہ کے مفصل مطالعے کا منصوبہ، جو میں نے آج سے کوئی دو دہائی پہلے ایک دھندلے ارادے کے طور پر ذہن میں قائم کیا تھا، آج تکمیل کے اس قدر نزدیک ہے کہ اس کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو بقیہ جلدیں بھی ہدیۂ ناظرین ہوں گی۔" حالات کی سازگاری سے میری مراد یہ تھی کہ صحت ساتھ دے اور دوسرے کاموں کا ابرام بہت زیادہ نہ ہو۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پہلی جلد کی اشاعت کے بعد حالات سازگار نہ رہے، لیکن وہ اتنے سازگار بھی نہ تھے کہ میں بقیہ جلدوں کو تعجیل کے ساتھ مکمل اور شائع کرا سکتا۔ فرمائشوں کی تکمیل، نئے اور غیر متوقع کاموں کا دباؤ، اور ساتھ ہی ساتھ "شب خون" کو ماہ بہ ماہ شائع کرتے رہنے کا بوجھ بہر حال اتنا تھا کہ زیر نظر کتاب کی رفتار سست پڑتی گئی۔ "شب خون" کی اشاعت مسدود کرنے کے بعد وقت اور حوصلے کی تنگی کچھ کم ہوئی تو میں "کئی چاند تھے سر آسماں" جیسا ضخیم ناول پورا کر سکا اور "ساحری، شاہی، صاحب قرانی" کی جلد دوم اور سوم مکمل کر سکا۔ جلد دوم آپ کے ہاتھوں میں ہے اور جلد سوم بھی بہت جلد انشاء اللہ اشاعت پذیر ہو جائے گی۔

گذشتہ جلد میں بیان کردہ منصوبے کے مطابق کتاب کی دوسری جلد کا عنوان "عملی مباحث" ہونا تھا اور اس میں "داستان امیر حمزہ کی اشاعت کا احوال، جلدوں کی تعداد، ان کی ترتیب باعتبار اشاعت اور باعتبار قصہ، داستان امیر حمزہ کے داستان گویوں (محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین، سید

اسمٰعیل اثر) کے حالات (جہاں تک، وہ معلوم ہیں)'' پر گفتگو ہونی تھی۔ اور اگر یہ جلد بہت طول نہ کھینچ گئی تو اس میں وہ مباحث بھی شامل کئے جانے تھے جن کا عنوان ''اشخاص و مقامات'' ہونا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جس حصے کو ''اشخاص و مقامات'' کا عنوان ملنا تھا وہ بہت ضخیم ہو گیا ہے اور اسے ایک طرح سے داستان امیر حمزہ طویل کی معنوی فرہنگ یا مختصر انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لہٰذا اب کتاب کی صورت یہ بنی ہے کہ ''عملی مباحث'' ایک (یعنی موجودہ) جلد میں ہیں اور اسے جلد دوم کہا گیا ہے، اور ''اشخاص و مقامات'' پر مبنی جلد کو ''جہان حمزہ'' کہہ کر تیسری جلد بنا دیا گیا ہے۔ چوتھی جلد انشاء اللہ حسب ارادہ داستان (طویل) کی انفرادی جلدوں کے مطالعے پر مشتمل ہوگی اور اس کا عنوان فی الحال وہی ہے، یعنی ''داستان دنیا''، جو پہلے تجویز کیا گیا تھا۔

داستان کے بارے میں اردو ادب کے شائقین، اور زبانی بیانیہ کے شائقین کی دنیا میں کچھ دلچسپی بڑھی ہے۔ افسوس ہے کہ میں یہی بات اردو کے نقادوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کا نصاب مرتب کرنے والوں اور اپنی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرانے والوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ میری دانست میں ابھی کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں داستان، یا داستان امیر حمزہ، یا بیانیات پر کوئی خاص توجہ دی جا رہی ہو۔ لے دے کر ایک پنجاب یونیورسٹی لاہور اور وہاں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ طالب علم رفاقت علی شاہد ہیں جن کی بدولت داستان کے مطالعات کو وہاں کچھ زندگی حاصل ہے۔ علی گڈھ میں قمر الہدیٰ فریدی کو داستان میں کچھ درک ہے، اور بس۔ داستان کی طرف سے عدم توجہی کا ایک سبب تو یقیناً خود ہمارے تنقیدی رہنماؤں کی عدم توجہی ہے۔ لیکن ہمارے طالب علموں اور ادب دوستوں کی سہل انگاری اور کم کوشی بھی کچھ معمولی سبب نہیں۔ داستان کو پڑھنا تھوڑے بہت صبر اور تھوڑے بہت علم کا تقاضا کرتا ہے۔ مشہور افسانہ نگار، شاعر، لغت نویس اور ماہر داستان محمد سلیم الرحمٰن نے حال میں کہا ہے کہ ''بہت سے لکھنے والے چھوٹی موٹی تحریر پڑھنے کو وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔'' لہٰذا یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ''ادب دوستوں'' کے دل میں ایسی کسی داستان کے لئے فی الحال کوئی وسیع دلچسپی پیدا ہوگی جس کی ہر جلد اوسطاً ایک ہزار صفحے کی ہے۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام پڑھنے والے اور زبانی بیانیہ سے عوامی دلچسپی رکھنے والے

ایسے لوگ کم تعداد میں سہی، لیکن اب سامنے آرہے ہیں جنھیں داستان امیر حمزہ کی ادبی اور بیانیاتی اہمیت کا کچھ احساس ہے۔ کئی سال ہوئے پاکستان میں ''طلسم ہوش ربا'' کی تمام جلدیں چھپی تھیں۔ وہ بہت جلد فروخت ہو گئیں، اب وہ جلدیں دوبارہ چھپی ہیں۔ ہندوستان میں خدا بخش لائبریری نے بھی ''طلسم ہوش ربا'' کی تمام جلدیں چھاپیں۔ وہ بھی مقبول ہوئیں اور اب بازار میں دستیاب نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رئیس احمد جعفری کی تلخیص ''طلسم ہوش ربا'' بھی لاہور سے دوبارہ چھپ گئی ہے۔ علی گڈھ میں قمر الہدیٰ فریدی نے ''طلسم ہوش ربا'' کی تلخیص پر مبنی جلدیں شائع کرانی شروع کی ہیں۔ ان تمام اشاعتوں کا مجموعی اثر یقیناً پھیلا ہے اور پھیلے گا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ مطبوعہ متون کو عامۃ الناس میں بہت زیادہ مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی ہے۔ اردو میں پڑھنے والے ہی کتنے ہیں؟ بلکہ یوں کہیں کہ پڑھنے والے تو ہیں لیکن پڑھانے والے ہی کتنے ہیں؟ بلکہ یوں کہیں کہ پڑھنے والے تو ہیں لیکن پڑھانے والے کتنے ہیں؟

گذشتہ ایک دو برس میں محمود فاروقی نے میرے مشورے سے داستان گوئی کی عام محفلیں منعقد کی ہیں۔ ''عام'' اس معنی میں کہ ہر محفل کے لئے پہلے سے اطلاع دی جاتی ہے اور سامعین کو دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں۔ پہلی محفل انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (India International Centre) نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ بانی محفل ''سرائے'' نام کا مشہور ادارہ تھا جو ایک مشہور غیر سرکاری انجمن سی۔ایس۔ڈی۔ایس (Centre for the Study of Developing Societies) کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ اردو جاننے والے اور اردو نہ جاننے والے سامعین کم و بیش برابر کی تعداد میں تھے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد اول کے کچھ اجزا دو داستان گویوں، یعنی محمود فاروقی اور ہمانشو تیاگی نے زبانی سنائے۔ ہمانشو کو اردو نہیں آتی لیکن انھیں اردو کے تلفظ اور اردو گفتگو/بیانیہ کے آہنگ کے بارے میں کچھ تربیت دی گئی تھی۔ دونوں طرح کے سامعین نے داستان، اور داستان گوئی کو بے حد پسند کیا۔ دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو کی منعقد کردہ ایک اور محفل داستان گوئی میں حبیب تنویر پاؤں کی تکلیف کے باوجود شریک مجلس ہوئے اور بے حد محظوظ ہوئے۔

دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) کی محفل کی غیر معمولی کامیابی کے نتیجے میں دہلی میں، اور پھر دوسرے شہروں، مثلاً دہرہ دون، پٹنہ، اور ممبئی میں داستان گوئی کی کئی محفلیں منعقد ہوئیں۔ دہلی کی ایک محفل

جامع مسجد کے محاذ میں برپا کی گئی اور ممبئی کی کئی محفلوں میں نصیرالدین شاہ نے دلچسپی لی اور بعض مجالس میں بانی محفل کی حیثیت سے خود بھی حصہ لیا۔ ہمانشو کے چلے جانے کے بعد دانش حسین نے دوسرے داستان گو کی حیثیت سے شرکت کی۔ ہمانشو تیاگی اور دانش حسین دونوں کو پیشہ ورانہ تھیٹر میں اداکاری کا تجربہ ہے۔ محمود فاروقی نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم پائی ہے اور انھیں بھی پیشہ ورانہ تھیٹر اور ٹی وی میں اداکاری اور ہدایت کاری کا تجربہ ہے۔

ظاہر ہے کہ داستان گوئی کی یہ مجالس روایتی مجالس سے مختلف ہیں، بدیں معنی کہ ان کا دورانیہ دو گھنٹے سے کچھ کم ہوتا ہے اور میرزا غالب کے مکان پر داستان گوئی کی محفلوں یا حکیم اجمل خان کے مکان پر میر باقر علی کی داستان سرائی کے مقابلے میں ان جدید محفلوں کا ماحول کچھ رسمی اور مصنوعی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ محمود فاروقی اور ان کے ساتھی داستان گوئی سے زیادہ داستان خوانی کی منزل کے فنکار ہیں۔ یعنی انھوں نے داستان گوئی کسی استاد سے سیکھی نہیں ہے، بلکہ وہ دوسروں کی لکھی ہوئی داستان کے اجزا اپنے جوہر قابل کے بل بوتے پر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو کچھ وہ سناتے ہیں وہ داستان ہی ہوتی ہے اور ان کا بیان داستان امیر حمزہ کو زبانی سنانے کی روایت ہی سے منسلک ہے۔

داستان امیر حمزہ پر انگریزی میں پہلا مفصل اور اب تک سے اہم کام ڈاکٹر فرینسس پرچٹ کا تھا۔ انھوں نے داستان (مختصر) کا معتد بہ حصہ سلیس انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسے ایک نہایت مبسوط دیباچے کے ساتھ کولمبیا یونیورسٹی پریس سے شائع کرایا۔ اب اگلا اہم کام ٹورانٹو میں مقیم انگریزی فکشن نگار اور مترجم مشرف فاروقی کا ہے جنھوں نے داستان (مختصر) کے ۱۸۷۱ ایڈیشن کا مکمل ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ مشہور امریکی پبلشر رٹلج (Routledge) کے زیر اہتمام شائع ہوگا۔ مشرف فاروقی نے طلسم ہوش ربا کی تمام (آٹھ) جلدوں کے انگریزی ترجمے پر کام شروع کر دیا ہے اور یہ منصوبہ غالباً ۲۰۱۰ تک مکمل ہو جائے گا۔ اس کے لئے بھی ناشر مہیا ہے، صرف کام پورا ہونے کی دیر ہے۔

داستان کے مطالعے اور زبانی بیانیہ کی حیثیت سے اس میں دلچسپی کا تھوڑا بہت حال جو میں نے اوپر بیان کیا، اسے میں امید افزا صورت حال کی علامت نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بیس

سال پہلے کے مقابلے میں آج کے حالات بہتر ہیں اور ہم سب لوگوں کو اس وقت کا انتظار ہے جب داستان ہمارے ادب کے عمومی مطالعات میں شامل ہو جائے گی۔ جب ایسا ہو جائے گا تو اس کے لئے عام پڑھنے والے بھی مہیا ہو جائیں گے۔

زبانی بیان کی قوت کے بارے میں سب سے بڑی بات افلاطون نے کہی تھی، اور وہ یہ تھی کہ جب آپ کوئی بیانیہ سنتے ہیں، خواہ وہ نظم ہو یا نثر، تو آپ ان واقعات میں خود شریک ہو جاتے ہیں جن کی روداد اس بیانیے میں سنائی جا رہی ہوتی ہے۔ اور ان واقعات میں شریک ہونے کے معنی (بقول افلاطون) یہ ہیں کہ آپ ان واقعات کے شاہد ہو جاتے ہیں اور آپ کی ذہنی کیفیات پر ان واقعات کا جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ اسی قسم کا ہوتا ہے جو ان واقعات کے چشم دید شاہد کی حیثیت سے آپ پر مترتب ہوتا۔ داستان کے مختصر اجزا سنانے کے جن تجربات کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے ان سے افلاطون کی بات سچ ثابت ہوتی ہے اور داستان کے نام نقادوں کا بیان غلط ثابت ہوتا ہے کہ داستان ''غیر ترقی یافتہ'' یا ''طفلانہ'' تہذیب یا ذہن کی پیداوار ہے اور ''شائستہ، ترقی یافتہ'' تہذیبوں یا ذہنوں کے لئے اس میں کچھ نہیں۔ پڑھنے کی سطح پر بھی داستان میں بہت کچھ ہے، لیکن سننے کی سطح پر داستان میں بہت کچھ اور بھی ہے۔ داستان کو سنیں تو ایک زندہ ماحول اور ایک زندہ سماج کا احساس ہوتا ہے اور گھر کے اندر پلنگ پر لیٹ کر یا کرسی پر دراز ہو کر داستان کو پڑھیں تو بھی زبانی بیانیے کی کشش سمندر کی زیر سطح لہر کی طرح آپ کو کھینچتی رہتی ہے۔ داستان کو سنئے تو آپ کو بھی وہ تمام جوش و خروش، وہ تمام رفتار اور حرکت، وہ تمام شور اور غوغا، وہ تمام نغمہ و موسیقی، لکھے ہوئے متن کے نیچے سنائی دیتی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ جب داستان سرائی ہماری تہذیب میں عام تھی تو کسی کو ان باتوں کی فکر نہ تھی کہ ان داستانوں کی ترتیب کیا ہے؟ ترتیب سے میری مراد قصہ جاتی ترتیب بھی ہے اور اشاعت کی ترتیب بھی۔ سنانے والے لوگ اپنی پسند کی داستان سیکھ کر یا زبانی یاد کر کے، یا دونوں طریقے ملا کر، یا کچھ فی البدیہہ اور کچھ حافظے کے بل بوتے پر داستان طرازی کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ شاید یہ ہوتا ہو کہ شائقین کسی خاص جلد یا داستان کے منتظر رہتے ہوں، کہ (مثلاً) ''طلسم ہفت پیکر'' کی تیسری جلد کب آئے گی، یا

فلاں جلد جو دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ چھپ رہی تھی، کب ہاتھ لگے گی۔ زبانی بیان کی تہذیب بھی یہی ہے کہ اسے ''تحقیق'' اور ''تاریخ'' سے سروکار نہیں ہوتا۔ یہاں ہر چیز ہر وقت یا بیک وقت ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی بھی ہے۔ لیکن نئے زمانے میں ان باتوں کی بہت اہمیت ہے کہ داستانیں کب اور کس طرح اور کتنی چھپتی تھیں اور ان میں کوئی ربط و ترتب ہے بھی کہ نہیں۔ نئے زمانے کے طالب علم کے لئے داستان زبانی متن بھی ہے اور ایک تحریری متن بھی ہے۔ یہ سوالات سب سے پہلے گیان چند جین نے اٹھائے تھے کہ داستان طویل کی نول کشوری کی مجموعی طور پر کتنی جلدیں ہیں، وہ یہ کب کب چھپیں، وغیرہ۔ کچھ سوالات جو بعد میں اٹھے ہیں وہ یہ ہیں کہ انفرادی جلدوں کی قیمت کس طرح متعین ہوتی تھی، ان کی تعداد اشاعت کیا ہوتی تھی، کون سی جلدیں زیادہ چھپیں، کون سی کم، وغیرہ۔ ایک سوال یہ بھی ہماری چھان بین کا مستحق ہے کہ داستان کی موجودہ شکل کس طرح بنی ہوگی اور اس کے بارے میں کیا افسانے یا مفروضے قائم یا شائع کئے گئے۔ یہ سوال اس لئے دلچسپی کا حامل ہو جاتا ہے کہ عام طور پر داستان کو چند داستان گویوں کی ''تصنیف'' قرار دیا جاتا ہے اور اس کی اچھائی (یا برائی) انھیں داستان گویوں، یا پھر ان کے ''سماجی حالات'' کے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ لیکن خود داستان گویوں، یا داستان سازوں کا اس کے بارے میں کچھ اور خیال تھا (یا وہ اس کے بارے میں کچھ اور خیال ظاہر کرتے تھے) اور خیال آرائی کا یہ رجحان داستان (مختصر) ہی میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا موجودہ جلد کا ایک باب ''داستان کا افسانہ'' نام سے ہے اور وہ انھیں سوالوں کے متعلق کچھ خیالات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کتاب کو درجۂ تکمیل تک لانے میں جن دوستوں کا تعاون رہا ہے ان میں سے کچھ کا شکریہ گذشتہ جلد میں ادا ہو چکا ہے، لیکن تکرار کے طور پر سب سے پہلے تو ترقی اردو کونسل کے پہلے وائس چیئرمین اور اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور اس وقت کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، پھر کونسل کے موجودہ کارکنان میں قائم مقام ڈائرکٹر محترمہ رشمی چودھری اور ان کے پہلے کے قائم مقام ڈائرکٹر جناب ایس۔ موہن، پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر ڈاکٹر روپ کشن بھٹ، اور دیگر کارکنان و افسران میں ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب انتخاب احمد، اور جناب محمد عصیم کا شکریہ واجب الادا ہے کہ ان لوگوں کے تعاون کے بغیر کتاب منظر عام پر نہ آسکتی تھی۔

دوستوں اور عزیزوں میں اسلم محمود، نیر مسعود، اور عزیزی خلیل الرحمٰن دہلوی کا شکریہ اس لئے ضروری ہے کہ انھوں نے، اور خاص کر اسلم محمود نے اصرار میں کبھی کمی نہ چھوڑی کہ داستان پر آپ کی تصنیف بہت جلد مکمل ہونی چاہیئے۔ اسلم محمود تو یہاں تک کہتے تھے کہ آپ سب کام چھوڑ دیجئے، داستان پر کتاب پوری کر دیجئے۔ اب جب کہ کتاب ختم کے قریب ہے، یعنی اس کی تین جلدیں تیار ہیں اور چوتھی پر کام شروع ہونے والا ہے، تو میں دعا کرتا ہوں کہ ان جیسے دوست اور بہی خواہ تمام مصنفوں کو نصیب ہوں۔

الہ آباد، جولائی ۲۰۰۶ شمس الرحمٰن فاروقی

چہ گوید کس از خوبی قصہ خواں

کہ در ملک خوبی است صاحب قراں

(حکیم افضل الدین خاقانی شروانی)

## باب اول

# کتنے دفتر، کتنی جلدیں؟

داستان امیر حمزہ (طویل، نولکشوری) جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے (اگر اس کی ناقدری، بے گھری، اور دنیا کے کسی کتب خانے، یا کسی ذخیرے میں اس کا مکمل شکل میں موجود نہ ہونا اس کا ہم تک ''پہنچنا'' کہا جائے)، اس کے اعتبار سے یہ داستان آٹھ دفتروں اور چھیالیس جلدوں اور کوئی چوالیس ہزار صفحات پر مشتمل قرار دی جاسکتی ہے۔ ''قرار دی جاسکتی ہے'' میں نے اس لئے کہا کہ دفتروں کی تعداد میں تو کوئی شک نہیں، لیکن جلدوں کی تعداد اور صفحات کی گنتی میں اختلاف، یا بحث کی گنجائش ہے۔ اور خود ''دفتر'' کی اصطلاح بھی کچھ وضاحت اور تجزیے کی طلب گار ہے۔ مثلاً امیر حسن نورانی مرحوم نے اپنے مضمون ''اردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانیں'' مطبوعہ ''ہماری زبان'' مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۰ میں لکھا ہے:

> ''طلسم ہوش ربا''، ''داستان امیر حمزہ'' کے طویل سلسلے کا ایک جزو ہے۔ اور اس سارے سلسلے کے مطبوعہ دفاتر کی تعداد اسی (۸۰) سے زیادہ ہے۔

چونکہ داستان امیر حمزہ طویل اور مختصر دونوں کو ملا کر بھی مطبوعہ مجلدات کی تعداد اسی (۸۰) سے بہت کم رہتی ہے، لہٰذا دفاتر کی تعداد بہر حال اس سے کم ہوگی۔ اغلب ہے کہ یہاں صاحب مضمون نے ''دفتر'' کی اصطلاح سے ''مجلدات'' مراد لی ہے، اور اس میں بھی مطبوعہ کے ساتھ غیر مطبوعہ جلدیں بھی شامل کر لی ہیں۔

لہٰذا سب سے پہلے لفظ ''دفتر'' پر غور کر لیں۔ یہ لفظ، یا اصطلاح، داستان طویل کی ہر جلد میں جگہ جگہ استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً ''صاحب دفتر نے یوں لکھا ہے''، یا ''صاحبان دفتر نے یہاں عجب بات

بیان کی ہے''، یا''اس جگہ صاحب دفتر کا بیان/کا کہنا یہ ہے''، وغیرہ۔ ارباب نول کشور پریس نے بھی جگہ جگہ ''دفتر'' کی اصطلاح برتی ہے، خاص کر جہاں وہ داستانوں کی فہرست درج کرتے ہیں۔ مثلاً اس سلسلے کی پہلی داستان (پہلی بہ اعتبار ترتیب واقعات، نہ کہ بہ اعتبار ترتیب اشاعت) ''نوشیرواں نامہ'' جلد اول کی اشاعت اول، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۹۳، کے سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے:

واضح ہو کہ داستان امیر حمزۂ صاحب قران وہ بحر ذخار ہے جس کے منتہائے قعر تک زنجیر فکر کا پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ جن صاحبوں نے یہ داستان ملاحظہ فرمائی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر داستان کا کس قدر حجم بزرگ ہے۔ اور ان کی اصول فارسی کے مصنف علام شیخ ابوالفیض فیضی نے جو ان داستانوں کو واسطے تفریح طبع جلال الدین محمدؐ اکبر بادشاہ کے تصنیف فرمایا، ان کی تصنیف میں کس قدر خون جگر کھایا ہوگا۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں، اور بعض دفتر کی کئی جلدیں، حسب تفصیل ذیل:

| تعداد دفتر | نام داستان | تعداد جلد |
|---|---|---|
| اول | نوشیرواں نامہ | ۲ جلد |
| دوم | کوچک باختر | ا جلد |
| سوم | بالا باختر | ا جلد |
| چہارم | ایرج نامہ | ۲ جلد |
| پنجم | طلسم ہوش ربا | ۷ جلد |
| ششم | صندلی نامہ | ا جلد |
| ہفتم | تورج نامہ | ۲ جلد |
| ہشتم | لال نامہ [کذا] | ا جلد |

ان داستانوں میں سے ''طلسم ہوش ربا'' کی پوری ساتوں جلدیں طبع ہو کر ملاحظۂ ناظرین میں گذریں۔ باقی زیر طبع ہیں۔ وہ بھی انشاء اللہ بہت جلد ہدیۂ ناظرین با تمکین ہوں گی۔ بالفعل نوشیرواں نامہ جو دو جلدوں پر منقسم ہے، اس کی جلد اول جس

کوگل گلزار فصاحت بلبل شاخسار بلاغت ماہر خوش بیان کامل شیریں زبان شیخ تصدق حسین صاحب داستان گونے حسب تحریک شیخ حامد حسین صاحب از جانب نول کشور پریس، بڑی جاں کاہی سے بزبان اردو نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ فرمایا باراول مطبع نامی منشی نولکشور واقع لکھنؤ میں طبع ہوئی

جون ۱۸۹۳ء

اعلان۔

حق تالیف اس ترجمہ کا بحق نولکشور پریس محفوظ و محدود ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس متعدد اعتبار سے دلچسپ ہے۔کئی باتوں پر بحث کا اس وقت موقع نہیں، سوا اس کے کہ ''نوشیرواں نامہ'' اول ،کی اشاعت دوم (نول کشور پریس کانپور، ۱۸۹۸) میں بھی یہی فہرست من وعن درج ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ پرانے جمائے ہوئے پتھروں سے دوسرا ایڈیشن چھاپتے وقت ارباب نول کشور پریس نے صرف تاریخ طبع بدلی ہے اور فہرست وہی پرانی کی پرانی برقرار رکھی ہے۔''نوشیرواں نامہ'' کی اشاعت دوم کے موقعے پر ایسا ہی ہوا۔درحقیقت ۱۸۹۸ تک داستان کی اور کئی جلدیں چھپ چکی تھیں۔لیکن ۱۸۹۳ کی محولہ بالا فہرست سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۹۳ تک داستان امیر حمزہ کی جلدوں کی مجموعی تعداد صرف سترہ (۱۷) تھی۔اور یہ تعداد بھی اصلی اور عملی نہیں، بلکہ مجوزہ تھی۔جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ''نوشیرواں نامہ''،دوم کی اول اشاعت ۱۸۹۸ میں ہوئی۔ لیکن چونکہ یہ بات طے پا چکی تھی کہ ''نوشیرواں'' کی دو جلدیں ہوں گی،لہٰذا دو جلدیں فہرست میں لکھ دی گئیں،اگرچہ اس وقت ایک ہی دستیاب تھی۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ (جیسا کہ ہم آئندہ تفصیل سے دیکھیں گے) ۱۸۹۳ تک صرف گیارہ جلدیں چھپی تھیں۔''نوشیرواں''،دوم کی اشاعت (۱۸۹۸) کی نوبت آتے آتے سولہ مزید جلدیں چھپ چکی تھیں۔یعنی اپنی مطبوعہ زندگی کے اولین پندرہ سولہ برسوں تک (اولین جلد جو شائع ہوئی، وہ ''طلسم ہوش ربا'' جلد اول، ۱۸۸۳، تھی) یہ داستان موجودہ حجم وضخامت کے مقابلے میں بہت مختصر، بلکہ موجودہ ضخامت کے مقابلے میں دو تہائی سے بھی کم تھی۔دوسری بات یہ کہ ۱۸۹۸ تک دفتروں کی تقسیم بھی

محض برائے نام تھی، کہ صرف دفتر اول (''نوشیرواں نامہ''، دو جلدیں)، دفتر چہارم (''ایرج نامہ''، دو جلدیں)، دفتر پنجم (''طلسم ہوش ربا'' سات جلدیں) اور دفتر ہفتم (''تورج نامہ''، دو جلدیں)، یعنی ''چار دفتروں'' میں ایک سے زیادہ جلدیں تھیں۔ باقی سب ''دفتر'' ایک ہی ایک جلد پر مشتمل تھے۔ اور اگر ''دفتر'' کے معنی'' کاغذات کا بڑا مجموعہ لئے جائیں، تو صحیح معنی میں ''دفتر'' تو ایک ہی تھا، یعنی ''طلسم ہوشربا''، جس میں سات جلدیں تھیں۔

وقت گذرنے، اور داستان کی مقبولیت اور شائقین کی مانگ کے بڑھتے رہنے کے ساتھ ساتھ نول کشوری داستان امیر حمزہ کی جلدیں بڑھتی گئیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، یہ رفتار شروع میں بہت سست تھی۔ پرانی (یعنی انیسویں) صدی کے آخری تین برسوں، اور نئی (یعنی بیسویں) صدی کے پہلی دہائی میں داستانوں کی اشاعت اور ان کی جلدوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ داستان کی مختلف مجلدات پر جو فہرستیں شائع ہوئی ہیں وہ جلدوں کی تعداد بتانے کے معاملے میں معتبر نہیں۔ مثلاً ''ہرمز نامہ'' کی اشاعت اول (۱۹۰۰) کے سرورق پر درج شدہ فہرست کے بموجب جلدوں کی تعداد سترہ سے زیادہ تو ہے، لیکن یہ اضافہ صرف ایک کا ہے۔ یعنی ''لال نامہ [کذا]'' کی جلدیں ایک کی جگہ دو ہوگئی ہیں اور اس طرح جلدوں کی تعداد اٹھارہ ہوگئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک اکتیس جلدیں چھپ چکی تھیں، لیکن بظاہر ارباب مطبع کی بے پروائی کے سبب سے فہرست ابھی وہی پرانی چل رہی تھی۔ ''آفتاب شجاعت'' جلد دوم، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۳ میں درج کردہ فہرست کے مطابق جلدوں کی تعداد اکتیس (۳۱) ہو جاتی ہے اور بہت سی نئی داستانوں کی متعدد جلدوں کے بارے میں ہمیں پہلی بار معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ''طلسم خیال سکندری'' مطبوعہ ۱۹۰۰ کی تین جلدیں یہاں پہلی بار مذکور ہوئی ہیں۔ غالباً یہ جلدیں ''ہرمز نامہ'' (۱۹۰۰) کی اشاعت کے وقت تیار نہ تھیں لہٰذا ان کا ذکر ''ہرمز نامہ'' میں نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں کے آخری چار پانچ برسوں، اور نئی صدی کی آغازی دہائی میں نئی داستانوں کی طباعت و اشاعت کی رفتار اس وقت اتنی تیز ہوگئی تھی کہ فہرستیں چھپتے ہی چھپتے پرانی ہو جاتی تھیں۔ شروع کی اس سست رفتاری، اور بعد کی تیزی کی وجہیں کئی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ارباب پریس تاجرانہ احتیاط سے کام لے رہے ہوں اور بازار کے بارے میں خود کو پوری طرح مطمئن کرنے کے بعد ہی جلدوں کی تعداد میں اضافے کا جوکھم اختیار کرتے ہوں۔

(۲) ارباب پریس مزید جلدیں چھاپنے پر تو راضی ہوں، لیکن ان کے پاس سرمائے، یا اشاعت داستان، کے بجٹ کی تنگی ہو۔

(۳) داستان گو حضرات لکھنے میں سست ہوں۔

(۴) خود داستان گو حضرات کو نہ معلوم ہو کہ جب وہ لکھنے بیٹھیں گے تو کوئی داستان (مثلاً ''آفتاب شجاعت'') کتنی جلدوں میں سمائے گی۔ ویسے، یہ بات کچھ زیادہ وثوق انگیز نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ داستان کو چھوٹا یا بڑا کرنا تو تقریباً تمام و کمال داستان گو کے ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا یہ کہا جائے کہ اہل پریس سے انھوں نے مصلحتاً کہہ دیا ہو کہ (مثلاً) ''لعل نامہ'' ایک ہی جلد میں آجائے گی۔ پھر لکھتے وقت داستان گو نے بات اتنی پھیلادی ہو کہ مجبوراً دو جلدیں کرنی پڑی ہوں۔ (اس کی تفصیل اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔)

(۵) داستان کی ہر دل عزیزی بڑھتی گئی تو اسی اعتبار سے داستان گویوں کا بھی حافظہ کھلتا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے دوسرے داستان گویوں سے (یعنی وہ داستان گو جو نول کشور پریس سے منسلک نہ تھے)، ان سے قیمت دے کر، یا محض دوستانے میں، یا نول کشور پریس تک ان کی رسائی کرانے کے وعدے کے ساتھ، ان کی داستانیں مانگ لی ہوں، اور پھر انھیں اپنے الفاظ میں پیش کیا ہو۔

(۶) یہ بھی ممکن ہے کہ داستان گویوں نے ادھوری، یا کم مشہور داستانوں میں اپنی اختراع کے زور پر اضافے کر کے نئی جلدیں تشکیل دے لی ہوں۔ اور اس طرح نئی داستانیں، یا پرانی داستانوں کے نئے روپ، سامنے آسکے ہوں۔

(۷) ادھر ارباب پریس کی بھی ہمت بڑھتی گئی ہو گی، اور انھیں نئی نئی

داستانیں شائع کرنے میں منفعت اور شہرت دونوں کا امکان نظر آتا ہوگا۔

(۸) بعض داستان گویوں، یا داستانوں، کو پریس کے باہر کوئی مربی مل گیا ہو، اور اس مربی نے کسی داستان کی اشاعت میں مالی امداد کی ہو، یا اس کی معتدبہ جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا ہو۔ ''آفتاب شجاعت'' کی چھ (۶) طویل و عریض جلدوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کی اشاعت میں نواب بہاول پور کی ہمت افزائی اور اعانت شامل تھی۔

(۹) اس بات کا امکان ہے کہ ''طلسم ہوش ربا'' (اشاعت ۱۸۸۳ تا ۱۸۹۳)، اور ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' (اشاعت ۱۸۹۷) کی بے مثال مقبولیت نے دوسری داستانوں کی اشاعت میں تعویق پیدا کردی ہو۔ یعنی ارباب مطبع نے خیال کیا ہو کہ جب تک یہ مقبولیت باقی ہے، اسی داستان کو بار بار چھاپنا چاہیئے، تا کہ منافع کثیر حاصل ہوتا رہے۔ ۱۸۹۷ میں نئی جلدوں/ داستانوں کی اشاعت کی رفتار بہت تیز نظر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ارباب مطبع کو پورا اطمینان ہوگیا ہے کہ ''طلسم ہوش ربا'' تو اچھی طرح قائم ہو چکی، اب نئی نئی داستانوں کی طرف رخ کرنے کا اچھا موقع ہے۔

اس خیال کو کچھ تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ ''طلسم ہوش ربا'' کی جلدیں داستان امیر حمزہ کی بقیہ تمام جلدوں سے زیادہ بار شائع ہوئی ہیں اور (جدید لاہوری اور خدا بخش لائبریری ایڈیشنوں سے قطع نظر کریں تو بھی) تقریباً عہد حاضر تک شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ محمد حسین جاہ نے نول کشور پریس سے الگ ہونے کے بعد ''طلسم ہوش ربا'' کی جلد پنجم اپنے طور پر بھی لکھ کر چھپوائی تھی۔ اس کی ایک اشاعت (دسمبر ۱۸۹۰) کا علم ہو سکا ہے۔ ممکن ہے اس جلد کی اور بھی اشاعتیں ہوئی ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جاہ نے کچھ مزید جلدیں بھی اپنے طور پر لکھی ہوں، حالانکہ اس کا امکان بہت کم ہے۔ جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کا مفصل ذکر اپنے وقت پر آئے گا۔

نول کشور پریس کے کاغذات ہماری دسترس میں ہوتے تو یہ بات معلوم ہو سکتی تھی کہ کسی مقررہ

جلد کی تعداد اشاعت کیا تھی۔ ڈاکٹر فرینسس پریچٹ (Frances Pritchett) نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مطبوعہ قصہ کہانیوں کی تعداد اشاعت اپنی کتاب موسومہ Marvellous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi میں درج کی ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ لمبی چوڑی داستانوں کی تعداد اشاعت، چھوٹے موٹے قصوں اور کہانیوں کی تعداد اشاعت سے پچاس فی صدی تک کم ہوسکتی ہے، اور یہ بھی فرض کیا جائے کہ قصہ کہانیوں کے ناشروں نے اپنے کاغذات میں تعداد اشاعت ٹھیک ٹھیک درج کی ہے، تو کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۸۱ سے ۱۹۱۰ کے درمیان ''طلسم ہوش ربا'' کی تعداد اشاعت اچھی خاصی رہی ہوگی۔ نیچے میں تین اردو قصوں کی بعض بعض جگہوں سے اشاعت کی تعداد ڈاکٹر پریچٹ کی کتاب سے اخذ کر کے لکھتا ہوں:

| | | |
|---|---|---|
| قصۂ حاتم طائی | ۲۰۰۰ | ممبئی، ۱۸۹۶ |
| قصۂ طوطا مینا | ۲۰۰۰ | لاہور، ۱۹۱۰ |
| ایضاً | ۲۰۰۰ | کانپور، ۱۹۱۱ |
| سیت بسنت | ۱۰۰۰ | شاہجہاں پور، ۱۹۰۸ |

ظاہر ہے کہ اشاعتیں اور بھی ہیں، اور ہندی میں اشاعتیں زیادہ ہیں۔ اردو میں ان قصہ کہانیوں کی مقبولیت بیسویں صدی کی دوسری، تیسری، اور چوتھی دہائی میں بڑھی۔ لیکن اگر میرے بیان کردہ مفروضے کو فی الحال قبول کرلیا جائے، کہ داستان کی جلدوں کی تعداد اشاعت اس زمانے میں قصہ کہانیوں کی تعداد اشاعت کی نصف سے کم نہ ہوگی، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''طلسم ہوش ربا'' کی جلدیں ہزار بارہ سو کی تعداد میں ضرور چھپتی ہوں گی۔ داستان (یک جلدی) کا قریب ترین نسخہ (نولکشوری) جو میرے پاس ہے (۱۹۶۹)، اس پر تعداد اشاعت تین ہزار (۳۰۰۰) لکھی ہے۔ لہٰذا یہ اندازہ، کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ''طلسم ہوشربا'' کی جلدیں ہزار بارہ سو ضرور چھپتی رہی ہوں گی، کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

میرے پاس ''طلسم ہوش ربا'' کی مختلف جلدوں کے جو نسخے ہیں، ان سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ داستان کتنی مقبول تھی۔ فہرست ملاحظہ ہو:

جلد اول:

(۱) قدیم ایڈیشن، لیکن پہلا نہیں۔

(۲) قدیم ایڈیشن، لیکن پہلا نہیں۔

(۳) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو ۱۹۳۰ کی اشاعت کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد دوم:

(۱) چوتھا ایڈیشن، ۱۹۱۲۔

(۲) چوتھا، مگر کانپور کا پہلا ایڈیشن، ۱۹۱۲۔

(۳) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو ۱۹۳۲ کے ایڈیشن کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد سوم:

(۱) دوسرا ایڈیشن، ۱۸۹۲۔

(۲) کانپور کا پہلا ایڈیشن، ۱۹۱۰۔

(۳) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو ۱۹۳۲ کی اشاعت کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد چہارم:

(۱) پہلا ایڈیشن، ۱۸۹۰۔

(۲) کانپور کا اول ایڈیشن، ۱۹۱۳۔

(۳) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو اشاعت مورخہ ۱۹۲۷ کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد پنجم حصۂ اول:

(۱) دوسری اشاعت، ۱۸۹۳۔

(۲) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو اشاعت مورخہ ۱۹۳۰ کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد پنجم حصۂ دوم:

(۱) دوسری اشاعت، ۱۸۹۳۔

(۲) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو اشاعت مورخہ ۱۹۳۱ کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد ششم:

(۱) دوسری اشاعت، ۱۸۹۳۔

(۲) قدیم ایڈیشن، مگر اول نہیں۔

(۳) قدیم ایڈیشن، مگر اول نہیں۔

(۴) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو اشاعت مورخہ ۱۹۴۰ کی فوٹو کاپی ہے۔

جلد ہفتم:

(۱) تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۵۔

(۲) چوتھا ایڈیشن، ۱۹۲۷۔

(۳) خدا بخش لائبریری ایڈیشن، جو ۱۹۲۷ ہی کی اشاعت کی فوٹو کاپی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ ملحوظ رہے کہ کسی ایڈیشن کو اگر صاحبان مطبع ''بار اول'' یا ''بار دوم'' وغیرہ کہتے ہیں تو بھی یہ امکان رہتا ہے کہ وہ دراصل اول یا دوم ایڈیشن کے فوراً بعد، یا کچھ بعد، کا کوئی ایڈیشن ہے۔ پتھر پر جمائی ہوئی پرانی کاپیوں کو دوبارہ استعمال کر لینا، اور ایڈیشن کی تعداد وہی رکھنا، نول کشور پریس میں عام تھا۔ لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلا ایڈیشن واقعی پہلا ایڈیشن ہو۔ اس کا تصفیہ تاریخ اشاعت سے ہی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صاف صاف موجود ہو۔ بہ الفاظ دیگر، ''بار اول'' کے معنی لازماً یہ نہیں کہ وہ دوسری یا تیسری اشاعت نہیں ہے۔

بہر کیف، مندرجہ بالا تفصیلات اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ داستان کی نئی جلدوں کی اشاعت میں سستی اور تیزی کا تعلق کاروباری اور دیگر (مثلاً) تصنیفی باتوں کے ساتھ ''طلسم ہوش ربا'' کی مقبولیت سے بھی ہو سکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جلدیں تو بڑھتی رہیں، لیکن ''دفتر'' وہی آٹھ کے آٹھ رہے۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ شروع کے اعلان شدہ آٹھ دفتروں، آٹھ داستانوں، اور سترہ جلدوں میں ''صندلی نامہ'' ایسی داستان ہے جس میں امیر حمزہ اپنی صاحب قرانی سے دست بردار ہوتے ہیں، اور یہ رتبہ ان کے بیٹے حمزۂ ثانی کو ملتا ہے۔ ''تورج نامہ'' میں زیادہ تر حمزۂ ثانی کے کارنامے ہیں۔ لیکن ان میں کسی اور

صاحبقراں کا ذکر نہیں۔ شروع کے سات دفتروں میں جو جلدیں بڑھیں (یعنی دفتر اول میں ''ہومان نامہ'' اور ''ہرمزنامہ'')، ان میں حمزۂ اول کے سوا کوئی صاحبقراں نہیں۔ لیکن آٹھویں دفتر میں جو داستانیں بڑھائی گئی ہیں، ان میں بعض ایسی ہیں (مثلاً ''آفتاب شجاعت'') جن میں صاحب قران ثالث (بدیع الملک)، اور پھر صاحبقران رابع (عادل کیواں شکوہ)، تک کا تذکرہ ہے۔

اس بحث کی روشنی میں ہم ''دفتر'' کی تعریف یوں متعین کر سکتے ہیں:

(۱) داستان امیر حمزہ نولکشوری کئی طویل داستانوں کا مجموعہ ہے۔ ان داستانوں کا آپسی ربط کچھ ڈھیلا ڈھالا ہے اگرچہ ربط موجود ہے اور خاصا واضح بھی ہے۔ اور جیسا کہ ہم جلد اول میں دیکھ چکے ہیں، ربط کی یہ ہرزگی، یا ڈھیلا پن، داستان کی شعریات کے عین مطابق ہے۔

(۲) وہ داستانیں جن کا آپسی ربط ایسا ہے کہ ان میں تسلسل زمانی کے ساتھ تسلسل علی (causal continuity) بھی کسی نہ کسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے، انھیں ایک دفتر کہا گیا۔

(۳) دفاتر کی یہ تقسیم خاصی پرانی اور مضبوط، یعنی نول کشور پریس کے ذریعہ داستان کی جلدوں کی اشاعت سے پہلے کی، معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس بات کے بارے میں بھی، کہ کسی دفتر کے مشمولات کیا ہیں، لوگوں کو (کچھ دھندلا ہی سہی لیکن) مستقل تصور ضرور تھا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ:

(۴) پبلشر نے، یا کسی داستان گو نے، ان کے خلاف جانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اور

(۵) وہ داستانیں جو بعد میں بڑھائی گئیں (پرانی داستانوں کو از سر نو زندہ کر کے، یا پرانی ادھوری داستانوں میں رنگ آمیزی کر کے)، ان میں سے وہ داستانیں جو اول تا ہفتم کسی دفتر سے مطابقت رکھتی تھیں، انھیں شروع کے سات دفتروں میں سے کسی ایک دفتر میں ڈال دیا گیا۔ یعنی، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ''ہرمزنامہ'' اور

''ہومان نامہ'' کو دفتر اول میں ڈالا گیا۔لیکن وہ داستانیں جن کے لئے اولین سات دفتروں میں کہیں جگہ نہ نکل سکتی تھی، انھیں آٹھویں دفتر میں ڈال دیا گیا۔

(۶) ''بقیۂ طلسم ہوشربا'' کی دو جلدیں یوں تو دفتر پنجم میں جانی چاہیئے تھیں، اور'' ہومان نامہ'' کی طبع اول (۱۹۰۱) کے ساتھ جو مختصر فہرست ہے، اس سے یہ بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' کی دونوں جلدوں کو'' طلسم ہوش ربا'' کے ساتھ رکھا گیا ہے۔لیکن ۱۹۱۱ کی مفصل فہرست میں انھیں دفتر ہشتم میں رکھا گیا ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ارباب مطبع کو پوری طرح شرح صدر نہ تھا کہ اس داستان کو کہاں رکھا جائے۔''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' چھوٹے چھوٹے متفرق سے وقوعوں کا مجموعہ ہے۔کوئی وقوعہ کسی جلد سے متعلق ہے تو کوئی وقوعہ کسی اور جلد سے۔ لہٰذا ارباب مطبع ''بقیہ'' کو کبھی دفتر پنجم میں رکھتے ہیں، اور کبھی دفتر ہشتم میں۔

(۷) دفتر ہشتم میں اولاً ایک ہی داستان تھی، یعنی ''لعل نامہ''، جسے داستان امیر حمزہ نول کشوری کی آخری داستان کہنا چاہیئے، کہ اس میں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عمرو عیار، ان سب کی موتیں واقع ہوتی ہیں۔لہٰذا ہشتم کے بعد کسی دفتر کا امکان نہ تھا۔جن داستانوں میں حمزۂ ثانی، ثالث، رابع، وغیرہ بھی ظہور پذیر اور عمل پیرا ہوتے ہیں، انھیں بھی دفتر ہشتم کے پہلے ہی رکھا جانا ممکن تھا، کیوں کہ صاحب قرانی کی اصل امیر حمزہ کے ساتھ ہے، اور عیاری کی اصل عمرو عیار کے ساتھ۔ جب یہ دونوں نہیں تو داستان بھی نہیں۔

اس طرح ہم یہ کہنے میں ایک حد تک حق بجانب ہوں گے کہ داستان امیر حمزہ، نول کشوری (طویل) کی اصطلاح میں ''دفتر'' ان داستانوں کا مجموعہ ہے جو آپس میں معمولی سے کچھ زیادہ ربط رکھتی ہوں۔لیکن ان معنی کا اطلاق دفتر ہشتم پر پوری طرح نہیں ہوتا۔دفتر ہشتم کو ایک طرح کا سفینہ یا کشکول کہہ سکتے ہیں، کہ اس میں آخری داستان (''لعل نامہ'') کے ساتھ بہت سی ایسی داستانیں ڈال دی گئی ہیں جو گذشتہ سات دفتروں سے کچھ بہت زیادہ ربط نہیں رکھتیں، اور ربط کی صورت محض یہ ہے کہ ان میں اور

باتوں کے علاوہ صاحبقران ثالث، اور صاحبقران رابع، یعنی امیر حمزہ کے براہ راست اخلاف اور کہیں کہیں خود امیر حمزہ کے کارنامے مذکور ہیں (مثلاً "آفتاب شجاعت"، "گلستان باختر" وغیرہ)۔

یہاں یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ کبھی کبھی ارباب مطبع نے بعد کی داستانوں (یعنی ان داستانوں کو، جنھیں بعد میں لکھا گیا اور دفتر ہشتم میں ڈالا گیا اور جن کا کوئی خاص ربط اول سات دفتروں سے نہیں)، ان کو کسی دفتر میں نہیں رکھا، بس یوں ہی درج فہرست کر دیا ہے۔ "بقیۂ طلسم ہوش ربا" کی مثال اوپر آچکی ہے کہ ۱۹۰۱ کی ایک فہرست میں اسے "طلسم ہوش ربا" کے ساتھ رکھا گیا ہے، لیکن اسے صاف صاف دفتر پنجم کا حصہ بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ پھر 1911 کی مفصل فہرست میں ہم اسے دفتر ہشتم میں دیکھتے ہیں۔ "آفتاب شجاعت" کو بھی اہل مطبع نے کبھی "دفتر آفتاب شجاعت" کہا، یعنی نہ آٹھواں نہ نواں، بلکہ صرف ایک دفتر، یا عملاً دفتر نہم۔ ایک آدھ جگہ "گلستان باختر" کو بھی "آفتاب شجاعت" کے "سلسلے کی داستان" بتایا گیا، گویا وہ بھی "دفتر آفتاب شجاعت" کا ایک حصہ ہے۔

میرا خیال ہے اس باب میں اہل مطبع کے ذہن (اور شاید داستان گویوں کے بھی ذہن) آہستہ آہستہ پوری طرح صاف ہوئے کہ بعد کی داستانوں (یعنی ان داستانوں کو، جن کا کوئی خاص ربط اول سات دفاتر سے نہیں)، ان کو کہاں ڈالیں؟ "ہرمز نامہ"، اور "ہومان نامہ" کا معاملہ تو آسان تھا، کہ وہ بے شک "نوشیرواں نامہ" سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں داستانیں بہت شروع سے دفتر اول میں ڈال دی گئی تھیں۔ اوپر میں نے 1911 کی مفصل فہرست کا ذکر کیا ہے، وہاں یہی کیفیت ہے۔ ملحوظ رہے کہ 1911 تک ایک ("گلستان باختر"، سوم) کے سوا داستان کی تمام جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور داستان کی تفصیلی صورت بھی سامنے آچکی تھی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1911 کی فہرست میں دفاتر کی جو تنظیم ہے اسے ارباب مطبع کی آخری اور مسکوک فہرست سمجھنا چاہیے۔ اس کی رو سے "بقیہ" کی دونوں جلدیں (شاید مختلف اور بنیادی طور پر غیر مربوط چھوٹی بڑی داستانوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے) دفتر ہشتم میں ڈالی گئیں، اور وہ تمام داستانیں جو بعد میں لکھی یا دریافت یا مرتب کی گئیں، اور جن میں سے اکثر میں صاحبقران سوم و رابع کے بھی کارنامے ہیں، دفتر ہشتم میں رکھ دی گئیں۔

اس بات سے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ پرانے (یعنی شروع کے سات دفتروں) کے

بارے میں داستان گویوں اور اہل مطبع کو دھندلے طور پر سہی، لیکن معلوم تھا کہ کس دفتر میں کون سی داستانیں، اور کتنی جلدیں ہوں گی۔ ''نوشیرواں نامہ'' کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کی جلد دوم چھپی تو ۱۸۹۸ میں، لیکن ۱۸۹۳ کی فہرست میں اس کا نام موجود ہے۔ لہٰذا اس امکان کو خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا کہ داستان امیر حمزہ کی مقبولیت جب بڑھنے لگی اور اس کی اشاعت کا پروگرام ایک بڑے منصوبے کی شکل اختیار کر گیا تو داستان گو اور صاحبان مطبع کسی داستان کے معرض تحریر میں آنے کے پہلے موٹے طور پر طے کر لیتے ہوں گے کہ اس میں کے جلدیں ہوں گی، اور اسے کس دفتر میں جگہ دی جائے گی۔

اس بات کا اعادہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ ربط کی کمی، یا کسی دفتر میں بہت سی داستانوں کا ڈال دینا، یا ضرورت اور عملی تاملات کے پیش نظر داستان کی طوالت کم یا زیادہ کرنا، یہ سب داستان (یعنی زبانی بیانیہ) کے اصولوں کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں۔ اس پر مفصل گفتگو جلد اول میں گذر چکی ہے۔

یہ دفتر کس نے بنائے، یا یہ کتنے قدیم ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ممکن نہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دفتروں کا کچھ تصور پہلے سے رہا ہوگا۔ لیکن یہ اتنا قدیم بھی نہیں جتنا بعض داستان گویوں، یا ارباب نول کشور پریس کے بیانات سے متبادر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ''رموز حمزہ'' مطبوعہ ممبئی (۱۹۰۹) میں یہ دعویٰ ہے کہ یہ اصل عربی سے ترجمہ ہے۔ اس میں دفتروں کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے مترجم میرزا محمد خان ملک الکتاب نے آغاز داستان میں لکھا ہے:

> چوں اصل ایں داستان در عربی بود، و فارسی زباناں از خواندن آں محروم بودند، لہٰذا ایں اقل احباب میرزا محمد خان ملک الکتاب در ترجمۂ آں بفارسی اقدام نمود... مخفی مباد کہ ایں داستان مشتمل است بر چہار جلد و مبنی بر ہفتاد داستان۔

**ترجمہ:**

> چونکہ یہ داستان اپنی اصل شکل میں عربی میں تھی اور فارسی والے اسے پڑھنے سے محروم تھے، لہٰذا احباب میں سے اس کم ترین، مرزا محمد خان ملک الکتاب، اس کا

فارسی ترجمہ کرنے میں پہل کی...اور واضح رہے کہ یہ داستان چار جلدوں پر مشتمل اور ستر داستانوں پر مبنی ہے۔

لہٰذا قدامت اور چار جلدوں کے دعوے کے باوجود یہاں دفتروں کا کوئی ذکر نہیں۔ کتاب میں دو جلدیں ضرور ہیں۔ یہ ایک ہی مجلد میں منطبع اور شیرازہ بند ہوئی ہیں۔ جلد اول کا نام ''نوشیرواں نامہ'' بتایا گیا ہے۔ یہ صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۳۶ تک مندرج ہوئی ہے، اور اس میں چھبیس (۲۶) داستانیں ہیں۔ جلد دوم کا کوئی نام بھی نہیں۔ اس کا آغاز صفحہ ۱۳۷ ہی پر ہوتا ہے اور اس میں ستائیس (۲۷) سے شروع ہو کر ستر (۷۰) تک داستانیں ہیں۔ کتاب صفحہ ۲۳۹ پر ختم ہوتی ہے۔

''زبدۃ الرموز'' بھی دفتروں کے ذکر سے خالی ہے۔ اس کے واحد نسخے (نسخۂ خدا بخش لائبریری) میں جلدوں یا داستانوں پر نمبر نہیں ہیں، نہ داستانوں کی تعداد مذکور ہے۔ اس کا مرتب/راوی حاجی قصہ خواں ہمدانی یہ ضرور کہتا ہے کہ:

> طبع عالی ایں شہریار بجمع کردن نسخہ ہائے غریب مائل بود خواست کہ...افسانہ کتاب ہا بنظر اشرف او بگذرانند چوں ایں کمینہ نسخۂ چندے ازیں حکایات از ملک عراق ہمراہ داشت، بنظر اشرف گذرانید، بہ ترتیب و ترکیب آں اشارۂ عالی صادر شد۔ بنا بر حکم نواب ہمایوں شروع در نوشتن نسخہ مسمی بہ زبدۃ الرموز شد امید کہ مقبول طبع عالی گردد۔

**ترجمہ:**

> اس شہریار [سلطان محمد قطب شاہ] کی طبع عالی نادر نسخوں کے جمع کرنے کی طرف مائل تھی۔ اس نے چاہا کہ [ایک لفظ مٹ گیا ہے]، اور افسانوں کی کتابیں اس کی نظر اشرف سے گذاری جائیں۔ چونکہ اس کم مرتبہ کے پاس ملک عراق کے کچھ نسخے ان حکایات میں سے تھے، لہٰذا اس نے انھیں نظر اشرف سے گذارا۔ اشارۂ عالی یہ صادر ہوا کہ ان کی ترتیب و ترکیب کی جائے۔ نواب مبارک کے حکم کی بنا پر میں نے اس نسخہ مسمی بہ ''زبدۃ الرموز'' کو لکھنا شروع کیا۔ امید کہ طبع عالی اسے مقبول

فرمائے گی۔

ظاہر ہے کہ یہاں بھی دفتروں کا مذکور نہیں، بلکہ داستانوں اور جلدوں تک کا مذکور نہیں۔ جیسا کہ ہم جلد اول میں دیکھ چکے ہیں، خلیل علی اشک اور غالب لکھنوی نے اپنی اپنی داستانوں کی چار جلدیں بتائی تھیں، انھوں نے چار دفتروں کی کوئی بات نہیں کی تھی۔

راز یزدانی نے لکھا ہے (مضمون مطبوعہ ''نگار'' لکھنؤ، بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۹) کہ انھوں نے ''رموز حمزہ'' مطبوعہ تہران (۱۲۷۵ / ۱۲۷۸ ہجری) دیکھی ہے۔ (برٹش لائبریری میں جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۲۷۴ / ۱۲۷۶ ہجری ہے۔ ممکن ہے راز مرحوم نے کوئی اور ایڈیشن دیکھا ہو۔) اس مضمون میں راز صاحب نے دفاتر کا نہیں، کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں ''رموز حمزہ'' منقسم ہے۔ راز صاحب لکھتے ہیں:

> اس 'رموز حمزہ' کو سات جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر جلد کو 'کتاب' کہا گیا ہے۔

لیکن ''آج کل'' دہلی، بابت جولائی ۱۹۶۰، میں شائع شدہ اپنے مضمون میں راز صاحب فرماتے ہیں کہ ''رموز حمزہ'' میں:

> صرف تین دفتروں کا نام ملتا ہے، نوشیرواں نامہ، ایرج نامہ، اور صندلی نامہ۔

اغلب ہے کہ یہاں لفظ ''دفتر'' سے مراد داستان امیر حمزہ نول کشوری (یا رامپوری) کے دفاتر سے ہو، کہ مندرجہ بالا تینوں نام یقیناً نول کشوری اور رام پوری داستان امیر حمزہ کے دفتروں کے بھی نام ہیں۔

''قصۂ حمزہ''، مرتبہ جعفر شعار (تہران ۱۹۶۸ / ۱۹۶۹) میں دفتروں کا پتہ نہیں۔ راز یزدانی نے ایک جگہ کسی ''رموز حمزہ'' کو ''عراق والی 'رموز حمزہ''' کا نام دیا ہے، اور کہا ہے کہ اس میں سات دفتر ہیں۔ لیکن یہ ''رموز'' کا کون سا نسخہ ہے، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتے۔ یقین ہے کہ انھوں نے تہران کے مطبوعہ نسخے کو اصلاً عراقی قرار دے کر اس کو ''عراقی'' کہہ دیا ہو۔ تہرانی ''رموز حمزہ'' کے بارے میں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ راز یزدانی نے کہا ہے کہ اس میں سات جلدیں، یا سات کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر فرینسس پرچٹ (Dr Frances Pritchett) کی اس بات میں صداقت محسوس

ہوتی ہے کہ تہرانی ''رموز حمزہ'' مطبوعہ ۱۲۷۴ / ۱۲۷۶ مطابق ۱۸۵۷ / ۱۸۵۹ کا کوئی نسخہ غالب کے پاس تھا۔ اور جب غالب نے ۱۸۶۱ / ۱۸۶۲ کے زمانے میں میرن صاحب کو لکھا:

> مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی... آگئی ہے...

تو ان کی مراد اسی نسخے سے تھی۔ ضخامت کے اعتبار سے تو یہ وہی نسخہ معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر راز یزدانی نے بھی کیا ہے۔ اس وقت جس بات کی طرف توجہ دلانا منظور ہے وہ یہ ہے کہ اگر اس میں سات دفتر ہوتے تو ممکن ہے کہ غالب نے جہاں ''پچاس ساٹھ جزو'' کا ذکر کیا، وہاں وہ دفتروں کا بھی ذکر کرتے۔

راز صاحب کے بارے میں بے حد احترام کا رویہ رکھنے کے باوصف مجھے کہنا پڑتا ہے کہ جن کتابوں یا ماخذ کو راز صاحب نے خود نہیں دیکھا تھا، ان کے بارے میں ان کے بیانات ہمیشہ محتاج تصدیق رہیں گے۔ چنانچہ، ان کا ارشاد ہے:

> علامہ فیضی نے ۱۶۰۱ / ۱۰۱۰ تک کسی زمانے میں داستان حمزہ کا ایک خوش خط اور مصور نسخہ دربار اکبر کے لئے مرتب کیا تھا جس کے بارہ دفتر تھے اور جس کا نام 'رموز حمزہ' تھا۔

اس پر عابد رضا بیدار نے درست لکھا ہے (''مقدمۂ طلسم ہوش ربا''، پٹنہ، بے تاریخ، ص ۸۸):

> تھوڑی ضخامت بڑھ گئی تھی؛ کام میں بھی مشکل پڑتی۔ اس لئے اسے بارہ حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ('دفتر' سے یہی مراد لیا جائے)۔ ابوالفضل نے یہی لکھا ہے۔

یہ بہرحال ممکن ہے کہ اٹھارویں صدی تک آتے آتے، اور کم سے کم ہندوستان میں، فارسی (اور شاید اردو بھی) داستان اتنی پھیل چکی ہو کہ اس کی وسعت کو منضبط کرنے کے لئے ''دفتر'' کا تصور ایجاد کیا گیا ہو۔ خلیل علی اشک اور غالب لکھنوی دونوں نے اصل داستان کی چودہ (۱۴) جلدوں کا ذکر کیا ہے، (اشک، صفحہ ۱، اور غالب لکھنوی، صفحہ ۲)۔ ''دفتر'' کا نام یہ لوگ نہیں لیتے، لیکن چودہ جلدوں کے ذکر سے ایک طرف اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کے سامنے ایک (یا کم و بیش ایک) ہی فارسی مخطوطہ

روایت تھی جس کا انھوں نے ترجمہ کیا۔ اور دوسرا امکان یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۰۰ آتے آتے اس داستان کی (زبانی یا تحریری، اغلب یہ ہے کہ زبانی) ضخامت اتنی ہو چکی تھی کہ اس کی چودہ جلدیں متصور کی جا سکتی تھیں۔ یہ تو بہر حال حقیقت ہے کہ ٹیک چند بہار کی ''بہار عجم'' (تاریخ تکمیل، ۱۷۵۲ کے آس پاس) میں داستان امیر حمزہ سے متعلق بعض ایسے اندراجات ہیں جن کا ماخذ وہ یک جلدی داستانیں (اردو یا فارسی) نہیں ہو سکتیں جن سے ہم واقف ہیں۔ میں ''بہار عجم'' سے ایک مثال پیش کرتا ہوں:

لعل خفتان:

لقب یکے از امرائے دست چپ حمزہ کہ قصہ موضوعہ اش شہرت دارد و گویند از فرزندان حمزہ و نام او قاسم است۔ میر نجات۔

زدست چپ ساقی آمد بہ مجلس

ملک قاسم لعل خفتان مینا

یہاں کئی باتیں توجہ طلب ہیں۔ اول تو یہی کہ ''لعل خفتان خاوری'' لقب ہے قاسم بن رستم بن حمزہ کا، اور اس کا کوئی ذکر ان مختصر (یک جلدی) داستانوں میں نہیں ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔ لہٰذا میر نجات کے شعر، اور ٹیک چند بہار کے اندراج کی بنیاد داستان امیر حمزہ کی کوئی زبانی اور طویل تر روایت رہی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ میر نجات کا زمانہ اواخر عہد اورنگ زیب (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷) اور پھر عہد شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۷۰۷ تا ۱۷۱۲) ہے۔ لہٰذا فارسی (اور ممکن ہے اردو) داستان کی طوالت اور مقبولیت اوائل اٹھارویں صدی میں اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ شعرا کے یہاں اس کے حوالے صرف مختصر داستان تک محدود نہیں رہ گئے تھے۔ تیسری بات یہ کہ بہار نے قاسم کو امیر حمزہ کا بیٹا کہا ہے، جب کہ ہماری داستان میں وہ امیر حمزہ کے بیٹے کا بیٹا ہے۔ لہٰذا قاسم کا کردار بھی زبانی روایت کے زیر اثر بدلا ہے۔ یعنی اگر قاسم اور امیر حمزہ میں باپ بیٹے کا رشتہ نہیں، اور قاسم خود داستان کے اہم کرداروں میں سے ہے تو اس کے باپ (یعنی امیر حمزہ کے بیٹے) کے بارے میں بھی بہت کچھ داستان سرائی ہونی چاہیے تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ رستم (علم شاہ) بن حمزہ کے بارے میں داستان گویوں نے خوب خوب لکھا ہے۔

لہٰذا داستان کی طوالت کے بڑھنے کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ کون کس کا بیٹا، یا پوتا، یا نواسا،

یا شوہر، یا داماد ہے اور وہ کتنا اہم کردار بنے، یا بنائے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ امیر حمزہ، یا ان کے کسی بیٹے کی اولاد کی ہمیت دوسرے کرداروں کے اخلاف سے زیادہ ہوگی۔ اور اخلاف کی تعداد جتنی بڑھے گی، داستان بھی اسی اعتبار سے طوالت پکڑنے کے امکانات رکھے گی۔ کرداروں کے اخلاف و اقارب کی داستانیں باپ ماں کے رتبے کے اعتبار سے بنائی جاتی ہیں۔ قاسم اگر بڑے باپ کا بیٹا اور باپ سے بھی زیادہ بڑے دادا کا پوتا ہے تو اس کے باپ کے بارے میں افسانہ طرازی بھی بہت بسیط اور کئی ملکوں پر محیط ہوگی۔ اس طرح داستان کا حجم بڑھتا جائے گا۔ اور جب حجم بڑھے گا تو داستان کو دفتروں میں تقسیم کرنے کی بات بھی آئے گی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دفتروں کی جس تقسیم سے ہم واقف ہیں، اس کی جڑیں زیادہ سے زیادہ اٹھارویں صدی میں پھوٹی ہوں گی۔

اگر نولکشوری داستان امیر حمزہ کے دفاتر کے سلسلے میں تھوڑی بہت الجھن ہے تو اس کی جلدوں کی تعداد کا معاملہ کچھ اور بھی پیچیدہ ہے۔ عام طور پر یہ تعداد چھیالیس (۴۶) بتائی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ داستان کی جلدیں چھیالیس ہی ہیں، یا زیادہ، یا کم؟ سراج منیر مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ جلدوں کی صحیح تعداد باون (۵۲) ہے، اور کراچی میں ایک صاحب ذوق کے پاس یہ تمام جلدیں موجود ہیں۔ لیکن سراج منیر کو ان صاحب کا نام پتہ کچھ نہ معلوم تھا، اور پاکستان واپس جا کر بھی وہ اس معاملے پر مزید روشنی نہ حاصل کر سکے۔ میں نے اپنے طور پر کراچی میں دوستوں سے پوچھا لیکن نہ ان باون جلدوں کے مالک صاحب کی خبر ملی، اور نہ کسی فہرست یا تحریر میں باون جلدوں کا ذکر ملا۔ اسلم فرخی نے مجھے بتایا کہ جمیل جالبی کے زمانہ وائس چانسلری میں داستان امیر حمزہ کی تمام جلدیں کراچی یونیورسٹی لائبریری کے لئے خریدی گئی تھیں۔ لیکن وہ کتنی تھیں، اس کا تعین وہ نہ کر سکے، اور نہ ابھی تک مجھے صحیح معلوم ہو سکا ہے کہ یونیورسٹی لائبریری میں کتنی جلدیں واقعی ہیں۔

علی بہادر خاں نے اکتالیس (۴۱) جلدیں بیان کی ہیں۔ لیکن انھوں نے ''آفتاب شجاعت'' کو خدا معلوم کیوں ایک ہی جلد قرار دیا ہے، درحالے کہ اس داستان کی نہ صرف پانچ جلدیں ہیں بلکہ جلد پنجم کے دو بھاری بھرکم حصے بھی ہیں۔ اس طرح ''آفتاب شجاعت'' کی جلدیں دراصل چھ ہوئیں۔ اس

طرح علی بہادر خاں کی گنتی بھی بڑھ کر چھیالیس تک پہنچ جاتی ہے۔

راز یزدانی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ ''آج کل''، دہلی، بابت جولائی ۱۹۶۰) میں لکھا ہے کہ انچاس (۴۹) جلدیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

'ہرمزنامہ'، 'آفتاب شجاعت'، اور 'گلستان باختر' وغیرہ سب کو گنا جائے تو انچاس جلدیں اور تقریباً پینتالیس ہزار صفحات ہوتے ہیں۔

یزدانی صاحب نے جلدوں کی فہرست، یا تفصیل کچھ نہیں درج کی ہے۔ لہٰذا ان کے دعوے کو بے دلیل ہی قرار دینا پڑے گا۔ ہاں، صفحات کی تعداد کے بارے میں ان کا اندازہ کم و بیش درست ہے، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے۔

گیان چند نے داستان کے مطالعے میں بہت سی اولیات حاصل کیں۔ ان میں جلدوں کی تعداد اور مفصل فہرست پر بحث بھی ہے۔ ان کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' کے دونوں ایڈیشنوں میں جلدوں کی تعداد چھیالیس ہی درج ہے۔ اس کے بعد ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ کے اودھ نمبر (۱۹۹۴) میں بھی انھوں نے یہی تعداد مقرر کی ہے۔

ایم۔ حبیب خاں نے اپنی کتاب ''اردو کی قدیم داستانیں'' میں دعویٰ کیا ہے کہ داستان امیر حمزہ کی جلدیں دراصل سینتالیس (۴۷) ہیں۔ وہ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر احمد حسین قمر کی داستان ''طلسم نارنج'' کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ''داستان امیر حمزہ کے پہلے دفتر ''نوشیرواں نامہ'' کی دراصل ایک کڑی ہے اور اس لحاظ سے ''طلسم نارنج'' کو بھی داستان (طویل) کی ایک داستان مان کر اس کی جلدوں کی مجموعی تعداد چھیالیس (۴۶) کی جگہ سینتالیس (۴۷) متعین ہونا چاہیے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ''طلسم نارنج'' کا مفصل ذکر پہلی بار حبیب خاں مرحوم نے کیا، لہٰذا اس داستان کے بارے میں ان کا ذوق و جوش قابل فہم ہے۔ اگر ''طلسم نارنج'' کو داستان امیر حمزہ نول کشوری (طویل) کی ایک جلد مان لیا جائے تو ''طلسم نارنج'' کی دریافت کو نقد و تحقیق داستان کا اہم سنگ میل تصور کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ گیان چند نے ''طلسم نارنج'' کا ذکر اپنی طول طویل کتاب میں بالکل سرسری طور پر کیا ہے۔ انھوں نے اس پر کوئی گفتگو بھی نہیں کی، صرف داستانوں کی فہرست میں اس کا نام لکھ

کر چھوڑ دیا ہے۔ یعنی گیان چند کے خیال کے مطابق ''طلسم نارنج'' کو داستان امیر حمزہ کا ایک حصہ ماننا تو دور رہا، اسے کوئی قابل ذکر داستان بھی نہیں کہہ سکتے۔

''طلسم نارنج'' کے بارے میں عام طور پر نقادوں کی خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ داستان بہت کمیاب ہے۔ حبیب خاں نے اس نسخے سے استفادہ کیا ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ کسی اور کتاب خانے میں اس داستان کے وجود کی اطلاع حبیب خاں کو نہیں، اور نہ مجھے ہے۔ مجھے لائبریریوں کے باہر صرف ایک نسخے کا علم ہوا اور وہ میرے پاس ہے۔ میں نے اسے ایم۔ حبیب خاں مرحوم کی کتاب کے شائع ہونے کے بہت عرصہ بعد حاصل کیا تھا۔ ممکن ہے اوروں کی دسترس انجمن کے نسخے تک نہ رہی ہو، یا کسی نے اسے اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہی نہ ہو کہ اس داستان کو داستان امیر حمزہ نول کشوری (طویل) کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہر حال، حبیب خاں کے استدلال کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''طلسم نارنج'' دراصل ''نوشیرواں نامہ'' کے متعلقات میں ہے۔ وہ اس داستان کو ''نوشیرواں نامہ' کی دراصل ایک کڑی'' بتاتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''طلسم نارنج'' اور کچھ نہیں ہے، دوسری داستانوں' کی ایک نقل بن کر رہ گئی ہے۔'' لیکن یہ دونوں دلائل کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر داستان گو جب کوئی داستان شروع کرتا ہے تو اس کا سلسلہ کسی پہلے سے موجود مشہور داستان اور دفتر سے ملاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آگے چل کر حبیب خاں مرحوم ''طلسم ہفت پیکر'' جلد اول کے بارے میں خود فرماتے ہیں (''اردو کی قدیم داستانیں''، ص ۳۴۳):

> سب سے بڑا عیب اس داستان میں یہ ہے کہ صفحہ ۴۱۲ سے ۵۵۸ تک خسرو شیر دل کے عروج کا جو قصہ ہے وہ بالکل ''طلسم نارنج'' میں عمرو بن حمزہ کی داستان کی نقل ہے، یہاں تک کہ قمر نے نام بھی تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

لہٰذا اگر خود ''طلسم ہفت پیکر'' کا ایک بڑا حصہ ''طلسم نارنج'' کی نقل ہے، تو ''طلسم نارنج'' پر نقل ہونے کا الزام لگانا بے معنی ہے۔ جیسا کہ ہم جلد اول میں دیکھ چکے ہیں، تکرار، یا کسی اور داستان کو اپنے تصرف میں لا کر اپنے رنگ میں رنگ دینا، داستان کے قواعد میں داخل ہے۔ حبیب خاں مرحوم کا یہ

الزام بھی کچھ بہت درست نہیں کہ ''ہفت پیکر''، جلد اول، کے صفحات ۴۱۲ تا ۵۵۸ ''طلسم نارنج'' میں ''عمرو بن حمزہ کی داستان کی نقل'' ہیں۔ خان صاحب نے خود لکھا ہے، اور صحیح لکھا ہے، کہ ''طلسم نارنج'' کی کل ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے۔ پھر اس میں کوئی ڈیڑھ سو صفحات بھلا کس طرح ''ہفت پیکر'' سے اخذ کی ہوئی محض ایک داستان کی نقل ہو سکتے ہیں؟ ہمیں یہ بھی خیال میں رکھنا چاہیئے کہ ''طلسم ہفت پیکر'' اور ''طلسم نارنج'' دونوں کے داستان گو احمد حسین قمر ہی ہیں۔ لہٰذا اگر انھوں نے اپنی بیان کی ہوئی داستان سے کچھ لے کر کہیں استعمال کر لیا تو کیا گناہ کیا؟ اور اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس سے یہ کہاں اور کیوں کر ثابت ہوتا ہے کہ ''طلسم نارنج'' دراصل داستان (طویل) کی ایک جلد ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''طلسم نارنج'' کا کچھ ربط ''نوشیرواں نامہ'' سے ہے۔ یعنی عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کے بارے میں جو روایت احمد حسین قمر نے یہاں بیان کی ہے، وہ اس واقعے کی ان روایتوں سے مختلف ہے جو داستان امیر حمزہ (یک جلدی) اور ''نوشیرواں نامہ'' میں درج ہیں۔ احمد حسین قمر لکھتے ہیں (''طلسم نارنج''، مطبوعہ نول کشور پریس، ۱۹۰۱، ص ۷/ ۸):

> شہر یونان میں عجب طرح کا معرکہ گذرا تھا... دفتر کا مضمون تو یہی ہے... کہ اس صورت میں [شہزادی] کو حمل رہا۔ حقیر کے نزدیک یہ امر خلاف ہے کہ نطفہ اس طرح قرار پائے۔ پس حقیر عرض کرتا ہے۔ کل داستان گو مطلب اول بیان کر چکے ہیں اور بیان کرتے ہیں، مگر حقیر عرض کرتا ہے...

قمر نے یہاں حسب معمول بڑبولے پن سے کام لیا ہے، اور حقیقت سے بھی آنکھ چرائی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا قصہ داستان امیر حمزہ کے زیادہ دلچسپ، زیادہ انوکھے اور زیادہ خندہ آور وقوعوں میں ہے۔ اس کو خلیل علی اشک نے اپنی جلد دوم، صفحہ ۲۲ تا ۲۳ پر کچھ نامکمل بیان کیا ہے، اور اس کا اختتام اسی جلد میں صفحہ ۷۵ /۷۶ پر درج کیا ہے۔ مختصراً، وقوعہ یوں ہے کہ امیر حمزہ کی شادی فریدوں شاہ یونانی کی بیٹی ناہید مریم سے ہوتی ہے۔ لیکن امیر یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ پہلی شب زفاف مہر نگار (معشوقۂ قدیم) کے ساتھ ہوگی، اور اس وقت تک ناہید مریم کو انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن قضائے کار ایک رات امیر حمزہ محتلم ہوتے ہیں اور خود کو رومال سے صاف کرتے ہیں۔ قضا و قدر کا انتظام کچھ یوں

ہوتا ہے کہ اسی رات ناہید مریم بھی محتلم ہوتی ہے۔ وہی رومال اتفاق سے ناہید مریم کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس طرح وہ حاملہ ہو جاتی ہے اور وقت مقررہ پر عمرو بن حمزہ کی پیدائش ہوتی ہے۔

ملحوظ رہے کہ عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی کے یہاں بالکل مختلف ہے۔ ان کے بموجب عمرو بن حمزہ کی پیدائش بالکل عام انسانوں کی طرح ہوئی تھی۔ لیکن قمر اس بیان کا ذکر نہیں کرتے، اگر چہ وہ عبداللہ بلگرامی والی داستان (یک جلدی) سے یقیناً آشنا رہے ہوں گے۔ ''نوشیرواں نامہ'' جلد اول، مصنفہ شیخ تصدق حسین کے صفحہ ۴۴۹ پر عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا حال کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ اشک نے لکھا ہے۔ لیکن اسی داستان کے اسی صفحے (۴۴۹) پر دوسرا بیان بھی موجود ہے جو مختصراً وہی ہے جو قمر نے باطناب بیان کیا ہے، کہ عمرو عیار نے شہزادی کی صورت مہر نگار کی بنادی اور اس طرح امیر حمزہ کو دھوکے سے اس کے ساتھ ہم بستر کرادیا۔ شہزادی کا نام بھی وہی ہے (یعنی گلشن آرا، نہ کہ ناہید مریم) جو تصدق حسین نے لکھا ہے۔ اس پر بھی قمر دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کے بیان میں ''صاحب دفتر'' اور دوسرے تمام داستان گویوں سے اختلاف کیا ہے۔

لہٰذا قمر کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ انھوں نے تمام داستان گویوں کی روایتوں کی ''اصلاح'' کی ہے، یا انھیں مسترد کر کے ایک نئی اور زیادہ قابل قبول روایت ایجاد کی ہے۔ لیکن اگر بالفرض یہ صحیح بھی ہوتا تو اس کی بنا پر ''طلسم نارنج'' کو داستان امیر حمزہ نول کشوری (طویل) کا حصہ قرار دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ داستان گویوں نے ایسی بہت سی داستانیں لکھیں جن میں امیر حمزہ یا اولاد امیر کے کارنامے اور مہمات درج ہیں۔ ان میں سے کچھ کی اشاعت بھی نول کشور پریس سے ہوئی۔ لیکن ہم انھیں داستان طویل کا حصہ نہیں سمجھتے، اور نہ ہی کوئی اور ایسا سمجھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''طلسم نارنج'' میں واقعات، کردار، اور عمومی فضا بالکل ویسے ہی ہیں جیسے داستان (طویل) کی کسی اور جلد میں۔ اور یہ بھی ہے (بلکہ یہ بات زیادہ توجہ انگیز ہے) کہ داستان (طویل) اور داستان (یک جلدی) دونوں میں ''نارنج'' نام کے ایک طلسم کا ذکر رواروی میں ایک دو بار آتا ہے۔ بلکہ غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی کی داستان میں ''نارنج پری'' نام کا ایک کردار بھی

ہے جس کی خاصی اہمیت ہے۔ عمرو بن حمزہ کے ہاتھوں طلسم نارنج کی فتاحی کا بیان ''نوشیرواں نامہ'' جلد اول، (داستان گو، شیخ تصدق حسین) میں بھی موجود ہے۔ تفصیلات کے لئے ''نوشیرواں نامہ''، طبع اول، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۹۳، ص ۵۸۷ تا ۶۳۵ ملاحظہ ہو۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد چہارم، مصنفہ محمد حسین جاہ، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۰ کے صفحہ ۱۲۰ پر ''طلسم نارنج'' کا حوالہ ہے:

> ایک کچھ ہم ہی نہیں عرش اعلیٰ پر گئے اور حمزہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ خداوند دم خبیثہ جو پہلی خداوند تھیں اور بندریا کے بھیس میں طلسم نارنج میں خدائی کرتی تھیں، وہ عمرو کے ہاتھ سے قتل ہوئیں۔

دم خبیثہ کا حوالہ داستان (طویل) میں جگہ جگہ ہے، لیکن مفصل بیان ''طلسم نارنج'' ہی میں ہے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہے کہ ''طلسم نارنج'' کا ربط داستان (طویل) اور داستان (یک جلدی) کی کئی داستانوں سے ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ خود قمر نے کہیں دعویٰ نہیں کیا، نہ ''طلسم نارنج'' میں، اور نہ اپنی تصنیف کردہ کسی اور داستان میں، کہ انھوں نے ''طلسم نارنج'' تصنیف کر کے داستان امیر حمزہ (طویل) کی جلدوں میں اضافہ کیا ہے۔ قمر کو لاف و گزاف اور اٹھلا اٹھلا کر بڑے بول بولنے کی تکلیف دہ عادت ہے۔ اگر ''طلسم نارنج'' کو داستان (طویل) کی ایک جلد کے طور پر قبول کر لیا گیا ہوتا تو ہم لوگ قمر کی زبان سے اس کے بارے میں سنتے سنتے تھک گئے ہوتے کہ انھوں نے داستان کی مستند فہرست (Canon) میں ایک نئی داستان داخل کی۔ انھوں نے ''طلسم نارنج'' کو داستان (طویل) کا جز و ایک قرار دلوانے کی ہلکی سی کوشش تو ضرور کی، لیکن اس میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں (''طلسم نارنج''، ص ۵):

> بابو جے نرائن صاحب مہتمم اخبار [اودھ اخبار] نے اس حقیر کو طلب فرمایا اور منظور ہوا کہ الف لیلہ تحریر ہو۔ پھر تجویز ہوا کہ طلسم نارنج تحریر کیا جاوے۔ حقیر نے قلم اٹھایا، مصروف تحریر ہوا۔

مندرجہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ارباب مطبع نے ''طلسم نارنج'' کو الگ سے ایک داستان

سمجھا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا، اور نہ ہی قمر یہ کہہ سکے، کہ داستان امیر حمزہ کی ایک کڑی ''طلسم نارنج'' بھی ہے، اسے لکھنا چاہیئے۔ قمر یہ چاہتے ضرور تھے کہ امیر حمزہ کی کوہ قاف والی مہمات کو ''نوشیرواں نامہ''، یا داستان (یک جلدی) سے لے کر دوبارہ لکھیں، اور اس طرح ایک اور جلد ''طلسم نارنج'' کے مانند ان کے حصے کے میں آجائے۔ ''طلسم نارنج'' کے صفحہ ۷ پر انھوں نے لکھا:

> صاحبقراں زماں پردۂ قاف پر گئے۔ اگر ناظرین اس طلسم[''طلسم نارنج''] کو پسند فرمائیں گے اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیویں گے تو پھر دوسرے ٹکڑے کو لکھوں گا، خدمت ناظرین میں پیش کروں گا۔

اپنی اس تمنا کو قمر نے داستان (''طلسم نارنج'') کے بالکل آخر (صفحہ ۲۰۷) میں دوبارہ ظاہر کیا:

> اب آگے داستان صاحبقران کا ذکر ہے کہ پردۂ قاف میں ہیں...اگر ناظرین اس طلسم[''طلسم نارنج''] کو ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے تو آئندہ اس کو بھی تحریر کروں گا۔

اس کے فوراً بعد قمر کے بیٹے اشتیاق حسین سہیل نے اپنی تقریظ (صفحہ ۲۰۸) میں ایسی ہی بات کہی، اور یہاں تک کہا کہ اگر اس ''طلسم نارنج'' کے دام کم رکھے گئے تو یہ داستان اور بھی مقبول ہو گی۔ دو جگہ ''ہاتھوں ہاتھ'' خریدے جانے، اور ایک جگہ دام کم رکھے جانے کے ذکر سے یہ بات متبادر ہوتی ہے کہ احمد حسین قمر نے ارباب پریس سے کہا ہوگا کہ ''طلسم نارنج'' بھی اسی طرح مقبول ہو سکتی ہے جس طرح داستان (طویل) کی دیگر جلدیں مقبول ہوئی ہیں۔ اور یہ بات وہ اسی وقت کہہ سکتے تھے جب ''طلسم نارنج'' کی حیثیت ایک الگ داستان کی ہوتی، کیونکہ اگر ''طلسم نارنج'' عام داستان امیر حمزہ میں شامل ہوتی تو اس کی مقبولیت، یا اس کے دام کم رکھے جانے کے بارے میں کوئی بات کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ داستان کی چھیالیس جلدوں میں کوئی جلد ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو۔

لیکن ''طلسم نارنج'' شاید کامیاب نہ ہوئی۔ یا پھر اہل پریس نے ''نوشیرواں نامہ''، اور عبداللہ بلگرامی کی یک جلدی داستان امیر حمزہ کے علی الرغم ایک اور داستان لکھوانا پسند نہ کیا۔ اور قمر کی تمنا

پوری نہ ہوئی۔ اس سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ داستان (طویل) کی تشکیل جس طرح ہو رہی تھی، صاحبان مطبع کو اس میں کوئی ردو بدل، یا تکرار، پسند نہ تھی۔ لہٰذا ''طلسم نارنج'' کو داستان (طویل) کے ایوان میں جگہ نہ مل سکی۔ قمر کی موت بھی تھوڑے عرصے کے بعد ہوگئی۔ لہٰذا بات آگے بڑھنے کا بھی امکان نہ رہا۔

''طلسم نارنج'' کو اگر داستان (طویل) کے زمرے میں رکھ دیا جاتا تو شاید وہ کچھ مقبول بھی ہو جاتی۔ بصورت موجودہ تو اس قدر گم نام رہی کہ حبیب خاں کے پہلے اس کا نام بھی شاید کچھ ہی لوگوں کو معلوم رہا ہوگا۔ تقدیر کی ستم ظریفی یہ ہے کہ حبیب خاں نے اس داستان کو کم و بیش دریافت کیا، اور خود انھیں کی نظر میں اس داستان میں کوئی خوبی، یا حافظے میں رہ جانے والی بات ہے ہی نہیں۔ اس طرح ''طلسم نارنج'' دوبارہ پیدا ہوئی اور دوبارہ نظروں سے غائب ہوگئی۔

ایک بات یہ بھی ہے، اور یہ بنیادی بات ہے، کہ نول کشور پریس کی کسی فہرست میں ''طلسم نارنج'' کا اندراج داستان (طویل) کے حوالے سے نہیں ہے۔ یعنی داستان (طویل) کی فہرست استناد (Canon) میں نول کشور پریس نے ''طلسم نارنج'' کو کبھی داخل نہ کیا۔ داستان (طویل) کے جس روپ سے ہم کو سروکار ہے وہ نول کشور پریس کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور جب نول کشور پریس نے ''طلسم نارنج'' کو کبھی داستان (طویل) کا حصہ نہیں بنایا تو ہمارے لئے غیر مناسب اور غیر ضروری ہے کہ ہم اسے داستان (طویل) کا حصہ قرار دیں۔

یقیناً داستان امیر حمزہ کی طویل روایتیں اور بھی ہیں۔ یہ روایتیں (فارسی یا اردو) رام پور میں وجود میں آئیں۔ ان کے علاوہ متفرق داستانیں بھی ہیں جن میں امیر حمزہ یا ان کی اولاد کے کارناموں اور طلسم کشائیوں کا ذکر ہے۔ یہ سب داستان (طویل) کے اس عینی وجود کا حصہ بے شک ہیں جس کی طرف میں نے جلد اول میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن داستان امیر حمزہ (طویل) کی نول کشوری روایت کا حصہ نہ رام پوری داستانیں ہیں، نہ لکھنؤ/دلی کی دیگر داستانیں (بشمول ''طلسم نارنج'')، نہ کاکوروی داستانیں۔ حتیٰ کہ داستان امیر حمزہ نولکشوری (طویل) کی وہ داستانیں بھی جو غیر مطبوعہ رہ گئیں، اور جن کے مسودے بقول امیر حسن نورانی ابھی مطبع کے گودام میں پڑے ہوئے ہیں، وہ بھی داستان (طویل) کی روایت میں

داخل نہیں قرار دی جاسکتیں۔

داستان امیر حمزہ (طویل، نول کشوری) کی جلدوں کی تعداد اور ناموں کے تعین کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ آیا اہل مطبع نے کسی جلد یا داستان کو اپنی فہرست میں شامل کیا ہے؟ اگر ایسا نہیں کیا تو وہ جلد یا داستان ہمارے مطالب کے لئے داستان (طویل) کا حصہ نہ قرار پائے گی، وعام اس سے کہ اس داستان یا جلد میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق امیر حمزہ اور/ یا ان کے اخلاف کی مہمات سے ہے کہ نہیں۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، مصنفہ محمد حسین جاہ کے معاملے کا بھی تصفیہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ محمد حسین جاہ نے نول کشور پریس سے الگ ہو کر گلاب سنگھ اینڈ سنز کے لکھنؤ دفتر میں ملازمت کرلی، اور وہاں انھوں نے ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم لکھی۔ اس بات کا تذکرہ سب سے پہلے غالباً خواجہ عبدالرؤف عشرت نے کیا۔ لیکن جاہ کی یہ داستان کہیں ملتی نہ تھی۔ اب کچھ دن ہوئے رفاقت علی شاہد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ ان کے اس کارنامے کی جتنی کی جائے، کم ہے۔ رفاقت علی شاہد نے ''خدا بخش لائبریری جرنل'' نمبر ۱۱۶ میں جاہ کی اس جلد پنجم پر مفصل مضمون لکھا ہے، جس میں انھوں نے بہت سی باتیں اٹھائی ہیں۔ ان پر بحث اپنے مقام پر ہوگی۔ لیکن مضمون کے شروع میں وہ کہتے ہیں:

> قمر اور تصدق حسین نے اپنے زور تخیل سے ضخیم ضخیم جلدیں لکھ کر داستان امیر حمزہ کی نول کشوری روایت میں اضافے کرنے شروع کیے، جن کی وجہ سے داستان کا سلسلہ مطبوعہ صورت میں سینتالیس جلدوں میں پھیل گیا۔

شاہد صاحب نے اپنے مضمون میں کوئی تفصیل ان سینتالیس (۴۷) جلدوں کی نہیں فراہم کی ہے، اور نہ یہ بتایا ہے کہ سینتالیس کی گنتی انھوں نے کہاں سے حاصل کی۔ لیکن انھوں نے اپنے مضمون کے حاشیہ نمبر ایک میں وضاحت ضروری ہے کہ سینتالیس (۴۷) کی یہ گنتی انھوں نے ''طلسم نارنج'' کو شامل کر کے حاصل کی ہے۔ رفاقت علی شاہد نے اپنے مضمون ''داستان امیر حمزہ کی نول کشوری روایت: چند وضاحتیں، چند سوال'' (مطبوعہ ''شب خون''، ۲۸۵، بابت اکتوبر ۲۰۰۴) میں اس معاملے پر طویل بحث

درج کی ہے۔ رفاقت علی شاہد کے نکات کا ذکر آگے آتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو استدلال میں نے گذشتہ صفحات میں ''طلسم نارنج'' کے بارے میں پیش کئے ہیں، ان کا اطلاق جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اول تو یہ کہ داستان (طویل) کے پبلشر، یعنی نول کشور نے جاہ کی جلد پنجم کو اپنی فہرستوں میں کوئی جگہ نہ دی۔ اور جگہ دیتے بھی تو کس طرح۔ جب وہ اسی زمانے میں احمد حسین قمر کی ''طلسم ہوش ربا'' کی پبلسٹی بڑے شد و مد سے کر رہے تھے اور محمد حسین جاہ سے ان کے تعلقات منقطع ہو چکے تھے اور اس انقطاع میں شاید کچھ تلخی بھی شامل تھی۔ ملحوظ رہے کہ محمد حسین جاہ کی تحریر کردہ ایک اور داستان ''طلسم فصاحت'' کا نام نول کشور پریس کی فہرستوں میں ہمیشہ نظر آتا ہے، لیکن داستان امیر حمزہ کے ذیل میں نہیں، بلکہ قصوں کے ذیل میں۔ مثلاً جاہ کی موت کے کئی سال بعد ۱۹۰۹ میں شائع ہونے والی ''گلستان باختر''، جلد اول، مصنفہ شیخ تصدق حسین میں تین صفحے کی ایک فہرست ہے۔ اس کے سرنامے کے طور پر حسب ذیل اعلان ہے:

> اطلاع۔ اس مطبع میں ہر علم وفن کی کتب کا ذخیرہ سلسلہ وار فروخت کے لئے موجود ہے جس کی فہرست ہر ایک شائق کو چھاپے خانے سے مل سکتی ہے جس کے معائنے و ملاحظے سے شائقین اصلی حالات کتب کے معلوم کر سکتے ہیں۔ قیمت بھی ارزاں ہے۔ اس کتاب کے ٹیٹل پیج کے تین صفحہ جو سادے ہیں ان میں بعض کتب قصہ جات نثر اردو کی درج کرتے ہیں تا کہ جس فن کی یہ کتاب ہے اس فن کی اور کتب موجودہ کارخانہ سے قدر دانوں کو آگاہی کا عمدہ تر ذریعہ حاصل ہو۔

اس کے بعد عنوان ہے: ''کتب قصہ جات نثر اردو''، اور فہرست کے تیسرے صفحے پر اندراج ہے:

> طلسم فصاحت۔ قصۂ عجیب وغریب از سید محمد حسین جاہ مرحوم۔ ۹ آنے

یعنی اگرچہ ''طلسم فصاحت'' بھی داستان ہی ہے، اور بقول جاہ، ان سے منشی نول کشور نے خود کہا:

> اے جاہ تیرا مرتبہ ایسا ہے کہ ہمارے حکم عالی کو دوش ہوش پر رکھے... یعنی ایک

> قصہ دلچسپ لاثانی دل لگی کی نشانی اگر لکھے تو اس شاہد دلفریب سخن کو حلیۂ طبع سے محلل اور آراستۂ زیور شہرت کیا جائے۔

یہ بھی تھا کہ بے حد اوق زبان کے باوجود یہ داستان بہت مقبول ہوئی اور کم سے کم چار بار چھپی یعنی ۱۸۷۴، ۱۸۸۱، ۱۸۸۴، اور ۱۸۹۲، (ملحوظ رہے کہ ''طلسم نارنج'' بالکل مقبول نہ ہوئی) لیکن ''طلسم فصاحت'' کو داستانوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا گیا۔ لہٰذا محمد حسین جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم، حصۂ اول، کو بھی داستان امیر حمزہ (طویل) کی فہرست استناد (canon) میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ جلدوں کی مجموعی تعداد چھیالیس ہی رہے گی۔

اب یہاں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ اگر داستان کے دفتر ہشتم میں کئی داستانیں ایسی ہیں جن کے واقعات بظاہر امیر حمزہ کے انتقال کے بعد پیش آئے ہیں، اور جن میں صاحبقران ثالث، پھر صاحبقران رابع، مرکزی یا اہم ترین کردار کے طور پر نظر آتے ہیں، اور دفتر ششم (''صندلی نامہ'') میں بھی امیر حمزہ کے بجائے حمزۂ ثانی کا دور دورہ ہے، تو پھر داستان (طویل) کو ایک داستان مانیں یا ایک سے زیادہ؟ اگر یہ پوری داستان ایک ہی ہے تو پھر ان جلدوں کو کہاں رکھیں جو بظاہر دفتروں کے باہر ہیں؟ اگر دو کہیں تو اس کے لئے جواز کیا ہو؟ داستان گویوں، یا داستانوں کے پبلشر، کسی نے کبھی نہیں کہا کہ دو داستانیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔

گیان چند جین نے اس مشکل کو یوں حل کیا ہے کہ انھوں نے گیارہ گیارہ دفتروں اور انتیس انتیس جلدوں کے دو سلسلے، یا چرخ (cycles) قائم کئے ہیں۔ لیکن جلدوں کی مجموعی تعداد چونکہ بہر حال چھیالیس ہی ہے، اس لئے دونوں سلسلوں میں کئی کئی جلدیں مشترک ہوگئی ہیں۔ اس طرح جلدوں کی تعداد اٹھاون ہو جاتی ہے۔ یعنی مجموعی گنتی چھیالیس ہے بھی اور نہیں بھی۔ پروفیسر گیان چند جین ارشاد فرماتے ہیں:

> صندلی نامے میں تین چار صفحوں کے بعد ہوش ربا کے آخر سے سلسلہ مل جاتا ہے۔ یہاں آٹھ دس صفحوں میں ہوش ربا کے آخری اوراق کی داستان کو دوسرے الفاظ میں درج کردیا ہے۔ لعل نامے کے بعد تصدق حسین نے آفتاب شجاعت اور

گلستان باختر تصنیف کی۔ ادھر احمد حسین قمر نے ہوش ربا کے بعد اپنے طور پر چند طلسم
تصنیف کیے۔ اس طرح گیارہ گیارہ دفتروں اور انتیس انتیس جلدوں پر مشتمل ذیل
کے دو سلسلے قائم ہوتے ہیں جن میں کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی ہے۔

گیان چند جین صاحب کے ترتیب دیئے ہوئے چرخ اور جلدوں کی زمانی (یعنی قصے کے اعتبار سے) کی تفصیل ذیل میں درج کرتا ہوں۔ (''اردو کی نثری داستانیں''، دوسرا ایڈیشن، لکھنؤ ۱۹۸۷، ص ۷۴۸ تا ۷۴۹):

| چرخ اول | چرخ دوم |
|---|---|
| نوشیرواں نامہ، دو جلدیں | ایضاً |
| ہرمز نامہ، ایک جلد | ایضاً |
| کوچک باختر، ایک جلد | ایضاً |
| بالا باختر، ایک جلد | ایضاً |
| ایرج نامہ، دو جلدیں | ایضاً |
| طلسم ہوش ربا، آٹھ جلدیں | ایضاً |
| صندلی نامہ، ایک جلد | طلسم فتنہ نور افشاں، تین جلدیں |
| تورج نامہ، دو جلدیں | طلسم ہفت پیکر، تین جلدیں |
| لعل نامہ، دو جلدیں | طلسم خیال سکندری، تین جلدیں |
| آفتاب شجاعت، چھ جلدیں | طلسم نوخیز جمشیدی، تین جلدیں |
| گلستان باختر، تین جلدیں | طلسم زعفران زار سلیمانی، دو جلدیں |

یہ ترتیب بعض مسائل کو تو حل کرتی ہے، لیکن اس سے بات پوری طرح سلجھتی نہیں، بلکہ کچھ اور الجھ جاتی ہے۔ ہمارا مقصود تو یہ تھا کہ تمام جلدوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ داستان کا سڈول پن symmetry بڑھ نہ سکے تو کم از کم پہلے کی طرح برقرار رہے۔ لیکن گیان چند کی ترتیب نے مطالعے میں

مشکل پیدا کردی ہے، کیوں کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ چرخ دوم میں ''طلسم ہوش ربا'' کے بعد ''صندلی نامہ'' کیوں نہ ہو، اور اس کی جگہ ''طلسم فتنۂ نور افشاں'' کیوں ہو؟ ہاں اگر ہم یہ فرض کر کے چلیں کہ یہ ایک نہیں دو داستانیں ہیں، تو اور بات ہے۔ پھر اس بات کی وجہ بھی نہیں ظاہر ہوتی کہ دفاتر کی گنتی آٹھ سے گیارہ کرنے کے لئے ناشر، یا داستان گو کی طرف سے کوئی دلیل ہے بھی کہ نہیں؟ (ظاہر ہے کہ نہیں ہے)۔ یہ بات بھی صاف نہیں ہوتی کہ اگر ہم ارباب مطبع، یا داستان گویوں کے کسی فیصلے سے صرف نظر کرتے ہیں تو ہمارے پاس اس کا جواز کیا ہے؟

پروفیسر گیان چند کی تجویز میں کچھ نقص اور بھی ہیں:

(۱) سلسلۂ اول، یا چرخ اول (first cycle) کی رو سے حمزۂ اول اور حمزۂ ثانی اور عمرو اول کی موت کے بعد بھی داستان جاری رہتی ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں، لیکن داستان کو ''داستان امیر حمزہ'' کہا جانے کی وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ امیر حمزہ کی موت، اور پھر بالخصوص عمرو اول کی موت کے بعد داستان ختم ہو جائے۔ عمرو اول کا مرنا اختتام داستان کے لئے یوں ضروری ہے کہ عمرو اور امیر دراصل ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگر بات کو ذرا جوکھم میں ڈال کر کہا جائے تو عمومی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ امیر حمزہ کی صفات بیشتر علوی ہیں اور عمرو کی صفات بیشتر سفلی ہیں، اور انسان میں عموماً یہ دونوں صفات یکجا رہتی ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ داستان کی منطق کی رو سے بھی یہ نوشتۂ تقدیر ہے کہ پہلے امیر حمزۂ اول کی شہادت ہو، پھر عمرو اول اپنی موت تین بار طلب کرے اور تب کہیں جا کر اسے موت آئے۔ گویا امیر حمزہ کی داستان حیات پر مہر اتمام اسی وقت لگے گی جب عمرو اول دنیا سے رخصت ہو۔

(۲) دوسرے چرخ میں امیر حمزہ کی موت نہیں ہوتی۔ اس میں وہی داستانیں ہیں جن میں امیر حمزہ خود سرگرم کار ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ داستان ختم نہیں ہوئی۔ تو پھر اصل دفتر میں ''لعل نامہ'' کے وجود کے کیا معنی ہیں؟ دفاتر کی پرانی ترتیب کے لحاظ سے ''لعل نامہ'' آٹھواں اور آخری دفتر ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس داستان میں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی، عمرو اول، اور لندھور بن سعدان کی موت واقع ہوتی ہے۔ اگر اسے داستان کا اختتام نہ مانیں تو کیا کہیں؟ اگر ہم انھیں دو چرخ نہیں، بلکہ دو داستانیں فرض

کریں، تو مشترک جلدوں کا کیا کریں؟ انھیں کس طرح بیان کیا جائے گا؟ پھر یہ بھی ہے کہ دوسرے چرخ کو کیا نام دیا جائے گا؟ ایک ہی جگہ سے شائع ہونے والی دو داستانوں کا ایک ہی نام تو ہو نہیں سکتا، بالخصوص جب ان کے لکھنے والے بھی مشترک ہوں۔

(۳) گیان چند کے دونوں ہی چرخ ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' سے خالی ہیں۔ ممکن ہے یہ سہو قلم ہو۔ لیکن مسئلہ پھر بھی رہ جاتا ہے کہ پبلشر کی فہرست مورخہ ۱۹۱۱ میں ''بقیہ'' کو آٹھویں دفتر میں رکھا گیا تھا، اور شروع کی فہرستوں میں اسے ''طلسم ہوش ربا'' کے ساتھ جگہ ملی تھی، لہٰذا سوال یہ ہے کہ گیان چند کے نئے نقشے میں اس کی جگہ کہاں ہو؟

(۴) اس سے زیادہ پریشان کن معاملہ یہ ہے کہ گیان چند کی فہرست میں ''ہومان نامہ'' بھی نہیں ہے۔ ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' سے تو یہ کہہ کر صرف نظر ممکن ہے کہ یہ ''طلسم ہوش ربا'' میں شامل ہے۔ لیکن ''ہومان'' تو اپنی جگہ پر مستقل اور مکمل داستان ہے۔ اگر چہ بعض باتیں اس میں اور ''نوشیرواں نامہ'' میں مشترک ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ''ہومان نامہ'' الگ سے ایک داستان ہے۔ اگر اسے گیان چند کے چرخ میں شامل قرار دیا جائے تو جلدوں کی تعداد بگڑ جاتی ہے، یعنی ایک چرخ میں تیس اور دوسرے میں انتیس جلدیں ہو جاتی ہیں اور سڈول پن مزید مجروح ہو جاتا ہے۔

(۴) زبانی بیانیہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ختم ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ''الف لیلہ'' ہے۔ یوں تو ''الف لیلہ'' کو ایک ہزار ایک راتیں گذر جانے پر ختم ہو جانا چاہیئے، اور ایک روایت کے بموجب ایسا ہوتا بھی ہے، لیکن ''الف لیلہ'' کی داستانیں ایک ہزار ایک راتوں کو محیط نہیں ہیں۔ یعنی آخری رات اور پہلی رات کے بیچ میں کئی راتوں کا، داستانوں کا، اور خود ان داستانوں کے اندر موجود قصوں کا فصل ہے۔ آج ہمیں عربی ''الف لیلہ'' کے بائیس قدیم مخطوطوں کا علم ہے۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جس میں مکمل ایک ہزار ایک راتوں پر مبنی کہانیاں ہوں۔ اور ایسا بھی نہیں کہ قدامت کے باعث بہت ساری داستانیں کھو گئی ہوں۔ شکاگو یونیورسٹی کے محسن مہدی نے قدیم ترین نسخ کی بنیاد پر اپنا متن ۱۹۸۴ میں شائع کیا، اور پھر حسین حدادی نے اس کا بہترین انگریزی ترجمہ ۱۹۹۰ میں شائع کیا۔ اس میں صرف دو سو اکہتر (۲۷۱) راتیں اور کوئی تینتیس داستانیں ہیں۔ ''الف لیلہ'' کی بعض مشہور ترین

داستانیں، مثلاً سند باد جہازی، علی بابا چالیس چور، اور علاء الدین اور جادوئی چراغ، کسی قدیم مخطوطے میں نہیں ملتیں۔

لہٰذا زبانی بیانیہ رسمی طور پر تو اختتام شاید رکھتا ہو، لیکن بیانیہ کے طور پر اس کی سچی عظمت، اور ادبی متن کے طور پر اس کی قوت اور بڑائی اسی میں ہے کہ وہ ختم نہیں ہوتا، بڑھتا رہتا ہے۔ اور اگر زبانی بیانیہ کی کسی روایت میں اس کا کوئی اختتام ہو بھی اور پھر بھی اس میں کوئی ایسی داستانیں نظر آئیں جو اختتام کی روایت بیان ہونے کے بعد وجود میں آئیں، تو اصولاً وہ دراصل ان واقعات پر مبنی ہیں جو اختتام کے پہلے پیش آئے، اگر چہ بیان بعد میں ہوئے۔

ان وجوہ کی بنا پر، گیان چند کے وضع کردہ دونوں چرخوں میں بعض خوبیوں کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ گیارہ گیارہ دفاتر، اور انتیس انتیس داستانوں پر مشتمل ان کا یہ ماڈل مجھے قابل قبول نہیں نظر آتا۔

دوسری، اور زیادہ اہم، بات یہ ہے کہ میرے خیال میں ایسا ماڈل وضع کرنا قطعی ممکن ہے جس میں دفتر وہی آٹھ ہوں، داستان کی جلدیں بھی وہی چھیالیس ہوں، اور پھر بھی انھیں اس طرح مرتب کیا جائے کہ داستانی تسلسل برقرار رہ سکے اور ایک کم و بیش مربوط داستان کا ڈھانچا قائم ہو سکے۔ اس کی تفصیل اگلے باب میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن ابھی یہ تصفیہ کرنا باقی ہے کہ داستان کی جلدیں کل ہیں کتنی؟ رفاقت علی شاہد نے ''طلسم نارنج'' کو داستان طویل میں شامل کیا ہے۔ لہٰذا یہ گفتگو اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جب رفاقت علی شاہد کے اس خیال کو زیر بحث لایا جائے کہ ''طلسم نارنج'' داستان (طویل) کا حصہ ہے، یعنی داستان کی جلدیں سینتالیس ہیں، چھیالیس نہیں۔

رفاقت علی شاہد نے اپنے محولہ بالا مضمون میں حسب ذیل استدلال پیش کیے ہیں:

(۱) داستان کی جلدوں کے تعین میں اہل مطبع کی فہرست کو حرف آخر ماننا کسی طور بھی مناسب نہیں۔

(۲) ارباب مطبع نے کبھی شعوری کوشش نہیں کی کہ داستان طویل کی جلدوں کا

تعیین کریں۔

(۳) جولائی ۱۹۰۸ کی مطبوعہ ''آفتاب شجاعت''، جلد پنجم، حصۂ اول، میں داستان کی جلدوں کی جو فہرست درج ہے، اس کی رو سے ''طلسم فتنۂ نور افشاں''، ''طلسم ہفت پیکر''، ''طلسم خیال سکندری''، اور ''طلسم نوخیز جمشیدی'' داستان کی فہرست سے ''علیحدہ درج ہیں۔''

(۴) ''نوشیرواں نامہ''، جلد دوم، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۱۵ میں جو فہرست درج ہے ''اس میں بھی بقیہ طلسموں کا اندراج الگ سے ہے، مگر 'طلسم نوخیز جمشیدی' اس فہرست میں موجود نہیں۔''

(۵) ... [ارباب مطبع] اگر ''طلسم نور افشاں'' [وغیرہ] کو بھی ''داستان طویل کا حصہ سمجھتے تو یقیناً ان کا اندراج بھی مسلسل نمبر شمار کے تحت داستان کی باقی جلدوں کے ساتھ کرتے۔''

(۶) ''ہومان نامہ'' طبع اول، ۱۹۰۰، میں شامل اشتیاق حسین سہیل کی تقریظ ''سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قمر، سہیل، اور اہل مطبع، تینوں ہی قمر کے تصنیف کئے ہوئے ضخیم طلسموں کو داستان طویل کی فہرست استناد (canon) کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔''

(۷) یہ کہنا کچھ اہمیت کا حامل نہیں کہ قمر نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ''طلسم نارنج'' داستان طویل کا حصہ ہے۔ ''ایسا دعویٰ تو قمر نے اپنے تحریر کردہ کسی طلسم کے بارے میں نہیں کیا۔''

جہاں تک رفاقت علی شاہد کے پہلے نکتے کا سوال ہے، تو یہ بات کچھ عجیب سی ہے کہ مطبع یعنی پبلشر کی فہرست کو ''حرف آخر'' ماننا درست نہیں۔ مطبع / پبلشر ہی تو وہ منبع ہے جہاں سے تمام جلدیں نکل کر ہم تک پہنچی ہیں۔ مطبع / پبلشر ہی طے کرتا ہے کہ کیا شائع ہو اور کیا شائع نہ ہو۔ مطبع / پبلشر ہی طے کرتا ہے کہ کسی سلسلۂ اشاعت کو کیا نام دیا جائے۔ مطبع / پبلشر ہی اپنی شائع کی ہوئی کتابوں کا مالک ہوتا ہے۔ پھر

اگر مطبع / پبلشر ہی غیر معتبر ٹھہرے تو کس کی بات مانی جائے گی؟ دوسرے نکتے کے باب میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مطبع نے جو مشرح اور مفصل فہرستیں شائع کی ہیں ان میں سے ۱۹۱۱ کی فہرست کا حوالہ میں نے کثرت سے دیا ہے۔ اس فہرست کے ہوتے ہوئے یہ بات کچھ معنی نہیں رکھتی کہ "ارباب مطبع نے کبھی کوشش نہیں کی کہ داستان طویل کی جلدوں کا تعین کریں۔"

"نوشیرواں نامہ"، جلد دوم، کی اشاعت مورخہ ۱۹۱۵ میرے سامنے نہیں ہے، لیکن "آفتاب شجاعت"، جلد پنجم، حصہ اول، میرے سامنے ہے۔ اس جلد میں مطبوعہ فہرست کو سمجھنے میں رفاقت علی شاہد سے کچھ غلطی ہوئی ہے۔ یہ فہرست اول، سرورق کی پشت (صفحہ ۲) سے شروع ہوتی ہے اور آخری سرورق کے پیچھے (صفحہ ۴) پر ختم ہوتی ہے۔ فہرست کے پہلے صفحے پر عنوان ہے، "کتب قصہ جات نثر اردو"۔ "قصہ جات نثر اردو" کی یہ فہرست صفحہ ۳ پر تمام ہوتی ہے (سہو کتابت سے اس صفحے پر نمبر ۳ کی جگہ نمبر ۲ درج ہے)۔ اس فہرست میں ستائیسواں اندراج "آفتاب شجاعت"، جلد چہارم کا ہے۔ باقی داستانوں پر بے شک کوئی نمبر نہیں پڑا ہوا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ ارباب پریس ان داستانوں کو داستان طویل کا حصہ نہیں شمار کرتے تھے؟ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ داستانوں کے سرورق اور اندرونی صفحات پر درج کی ہوئی فہرستیں پوری طرح مستند نہیں ہیں۔ سرورق کے چھپتے وقت جو سامنے رہتا تھا وہی کسی خاص اہتمام کے بغیر درج ہو جاتا تھا۔ چنانچہ "آفتاب شجاعت"، جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۰۴ میں خود "آفتاب شجاعت" کی جلد اول اور جلد دوم کا کوئی ذکر اندرونی سرورق کی فہرست میں نہیں ہے۔ "آفتاب شجاعت"، جلد چہارم، مطبوعہ ۱۹۰۵ کے اندرونی سرورق پر "دفتر آفتاب شجاعت" کا اندراج نمبر ۲۴ پر ہے، اور الفاظ یہ ہیں: "دفتر آفتاب شجاعت، متعلق جلد دوم لعل نامہ"۔ یعنی جلد نمبر کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ تین جلدیں اس داستان کی قبلاً شائع ہو چکی ہیں۔

لہٰذا ان فہرستوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر یہاں "طلسم ہفت پیکر" وغیرہ جلدوں کو کسی دفتر سے متعلق نہیں کیا گیا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اندرونی سرورق کی یہ فہرستیں کسی منصوبے یا دفتر بندی کے کسی اصول کے بغیر بنائی گئی ہیں۔ اب میں ۱۹۱۱ کی فہرست سے بعض اقتباسات یہاں پیش کرتا ہوں:

دفتر آفتاب شجاعت:

یہ سب نئی داستانیں ہیں، نہایت رنگین و دلچسپ، اور ان کا سلسلہ جلد دوم لعل نامہ سے ملتا ہے (صفحہ ۲۳۹)۔

گلستان باختر، جلد اول:

اس دفتر کا سلسلہ جلد پنجم حصۂ دوم آفتاب شجاعت سے ملتا ہے (صفحہ ۲۴۰)۔

طلسم ہفت پیکر:

یہ سب جلدیں داستان امیر حمزہ کی شاخیں ہیں... چنانچہ اس طلسم کا سلسلہ طلسم فتنۂ نور افشاں سے ملتا ہے (صفحہ ۲۴۲)۔

طلسم نوخیز جمشیدی:

اس کا بھی سلسلہ داستان کے سلسلے سے ملتا ہے (صفحہ ۲۴۳)۔

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ ارباب پریس کی نظر میں یہ سب داستانیں درحقیقت داستان امیر حمزہ طویل ہی کے حصے ہیں جو داستان گویوں نے اب مجتمع کیے ہیں۔

رفاقت علی شاہد کے خیال میں ''ہومان نامہ'' کے آخیر میں مندرج میں اشتیاق حسین سہیل کی تقریظ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ''قمر، سہیل، اور اہل مطبع، تینوں ہی'' قمر کے تصنیف کردہ ''ضخیم طلسموں'' کو داستان کی فہرست استناد کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ اشتیاق حسین سہیل، بلکہ خود قمر، کیا سمجھتے تھے، یہ ہمارے لئے چنداں لائق توجہ نہیں۔ قمر تو خود کو کم و بیش پورے ہی ''طلسم ہوش ربا'' کا خالق سمجھتے تھے۔ اصل تصفیہ تو ارباب پریس کی ذات پر منحصر تھا، کہ وہ کس داستان کو کیا قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہم ذرا اشتیاق حسین سہیل کی تقریظ کو پڑھ کر دیکھیں کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں:

پندرہ سولہ جلدیں خاص تصنیف کردۂ والد ماجد ہیں جن کو دفتر سے کچھ واسطہ نہیں۔
نام ان کے بدیں تفصیل ہیں: جلد پنجم ہوش ربا دو جلد میں و جلد ششم کہ منتخب جلد ہے
بعد اس کے جلد ہفتم و دو جلد موسوم بہ بقیۂ ہوش ربا...

(''ہومان نامہ''، طبع اول، ۱۹۰۱، صفحہ ۸۱۳)

ملاحظہ فرمایئے، اگر رفاقت علی شاہد کی تعبیر درست سمجھی جائے تو قمر، سہیل، اور اہل مطبع، سبھی کے خیال میں ''طلسم ہوش ربا'' جلد اول تا چہارم ہی داستان کی فہرست استناد میں تھیں اور جلد پنجم تا ہفتم اور ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' کی دو جلدوں کا ''دفتر سے کچھ واسطہ نہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ رفاقت علی شاہد بھی اس تعبیر کو تسلیم نہ کریں گے۔

اب رہی آخری بات، کہ احمد حسین قمر نے تو اپنے تحریر کردہ کسی طلسم کے بارے میں دعویٰ نہیں کیا کہ وہ داستان طویل کا حصہ ہے، تو یہی تو اصل بات ہے۔ دفتروں کی دوسری جلدوں کے بارے میں انھیں اطمینان تھا کہ وہ جلدیں تو بہر حال داستان طویل میں شمار ہوں گی۔ ان کے بارے میں دعویٰ کرنا ضروری نہ تھا۔ لیکن جہاں جہاں انھیں شک ہوتا ہے کہ ان کی ''تصنیف'' کے بارے میں کوئی شک اٹھ سکتا ہے، تو وہ اپنا دعویٰ داخل کرنے سے ہرگز نہیں چوکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''طلسم ہوش ربا'' کے بارے میں لمبے لمبے دعوے کرتے ہیں کہ میر احمد علی نے کچھ لکھا تو تھا، لیکن میر احمد علی بھی کیا تھے، اصل ''مصنف'' تو میں ہوں اور محمد حسین جاہ بچارے کا تو وجود ہی وہ نہیں مانتے، انھیں ''محرر'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر انھیں اس بات کی فکر ہوتی کہ ''طلسم نارنج'' کو داستان طویل کا حصہ ضرور سمجھا جائے تو وہ ہمیں بار بار اس طرف متوجہ کرتے۔ ان کی خاموشی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ''طلسم نارنج'' کو وہ داستان طویل کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

مندرجہ بالا محاکے کی روشنی میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ داستان طویل کی جلدیں چھیالیس ہیں، سینتالیس یا اٹھاون یا باون نہیں ☆☆

# باب دوم

## ترتیب داستان

ایک طرح سے دیکھئے تو داستان کے کسی چرخ (cycle) کو کسی ترتیب کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ہم جلد اول میں دیکھ چکے ہیں، ہر داستان کسی نہ کسی معنی میں خود مکتفی ہوتی ہے، اور اس کی بناوٹ خانہ بہ خانہ (modular) یا زنجیرہ نما ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو کہیں سے بھی کم یا زیادہ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ داستان کا اصل ڈھانچا مجروح نہ ہو۔ لیکن چونکہ داستان امیر حمزہ (طویل) کئی جلدوں اور داستانوں کی شکل میں ایک ہی پبلشر یعنی نولکشور پریس نے کئی برس کے عرصے میں شائع کی، لہٰذا سوال اٹھنا فطری ہے (خواہ یہ سوال بہت ضروری نہ بھی ہو) کہ اب ان الگ الگ داستانوں کو کس ترتیب سے ایک دھاگے میں پرویا جائے؟ ملحوظ رہے کہ خود ارباب مطبع نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے بہت کیا تو اتنا کہ دفاتر کا ایک ذرا ڈھیلا سا نظام قائم رکھا اور کبھی کبھی وضاحت بھی کر دی کہ کس داستان یا کس جلد کا سلسلہ کس داستان یا کس جلد سے ملتا ہے۔ لیکن انھوں نے، یا داستان گویوں نے، کبھی اس بات کی منا ہی بھی نہیں کی کہ داستان (طویل) کی تمام جلدوں کو واقعات کے لحاظ سے کو کسی زمانی ترتیب میں منظم کیا جائے۔ داستان گویوں نے بھی جگہ جگہ کہا ہے کہ یہ داستان (یا جلد) فلاں داستان کے ''متعلقات'' میں ہے۔ بعض جگہ یہ بھی کہا گیا ہے (جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں) کہ اس داستان (یا جلد) کا سلسلہ فلاں جلد سے ملتا ہے۔ لہٰذا داستان کی چھیالیس جلدوں کو واقعات کے لحاظ سے کسی طرح کی زمانی ترتیب میں قائم کرنا کوئی نامناسب کارروائی نہ کہلائے گا۔

داستان امیر حمزہ طویل جس (مطبوعہ) صورت میں ہمارے سامنے ہے اس میں کبھی کبھی ایسا

ہوا ہے کہ کسی داستان میں ایسا منظر یا وقوعہ بیان ہوا ہے جس کے بارے میں ہم (اپنے مطالعے کی روشنی میں) جانتے ہیں (یا بعد میں اس بات سے واقف ہوتے ہیں) کہ یہ داستان، یا یہ وقوعہ، یا یہ منظر، جس جگہ بیان ہوا ہے وہاں کا ہے نہیں، پہلے یا بعد کا ہے۔ مثلاً کسی موقعے پر ہم کسی اہم کردار کو زندہ سرگرم عمل دیکھتے ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ گذشتہ فلاں داستان میں اس کی موت ہو چکی ہے۔ یا ہم کسی وقوعے یا داستان کو کسی جلد میں پڑھتے ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ وقوعہ تو پہلے فلاں جلد میں پیش آچکا ہے۔ لہٰذا اگر داستان گو نے عمداً یا سہواً تکرار نہیں کی ہے تو یہی کہنا پڑے گا کہ داستان میں ترتیب زمانی کا اتنا اور ایسا خیال نہیں رکھا جاتا جتنا اور جیسا مثلاً جدید ناول میں ہوتا ہے۔ یہ داستان کا عیب نہیں، اور نہ ہی کوئی خوبی ہے۔ یہ بس ایک صفت ہے جو تمام زبانی بیانیے میں مشترک ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے: داستان کہنے والے بے شمار ہیں، اس معنی میں کہ داستان گوئی جہاں رائج ہوگی وہاں بہت سے داستان گو ہوں گے۔ پھر زبانی بیانیہ کی عام صفت کے مطابق ہر داستان گو اپنی داستان کا بیان کنندہ ہوگا۔ وہ اپنی داستان/داستانوں میں حسب ضرورت، یا اپنی تخلیقی اپج کے مطابق ایجاد و اضافہ بھی کرے گا۔ اس طرح، یہ صورت حال ہمیشہ پیدا ہوگی کہ کسی داستان گو کے پاس داستان کا کوئی روپ ہے، اور کسی دوسرے داستان گو کے پاس اسی داستان کا کچھ مختلف روپ ہے۔ لیکن یہ روپ بہر حال اتنا مختلف نہ ہوگا کہ داستان کے بنیادی وقوعے یا بنیادی حصے ہی بدلے ہوئے نظر آنے لگیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی کردار پڑھنے والوں یا سننے والوں کے تخیل اور حافظے کو اس طرح متحرک کر دیتا ہے کہ شائقین اس کے بارے میں جاننے اور سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ اور اگر وہ کردار کسی ایسی تحریر میں آئے جو سلسلہ وار بالاقساط شائع ہوتی ہے، یا اگر داستان میں آئے، جو مختلف اوقات میں بالاقساط بیان ہوتی ہے، تو شائقین اس کردار کے بارے میں یہ پڑھنا یا سننا پسند نہیں کرتے کہ اس کی موت ہوگئی، یا اس کی مہمات اور کارناموں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا یہ بھی ہوتا ہے کہ سامعین یا پڑھنے والے فرمائش کرتے ہیں کہ فلاں کردار کے بارے میں داستان سنائیے یا لکھیے۔ سامع یا قاری کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ہمارا محبوب کردار تو مر چکا ہے۔ داستان تو سامع/قاری کے وجود میں جاری ہو جاتی ہے، زمان کی وہاں اہمیت نہیں، مکان کی ہے۔ لہٰذا اگر ہم داستان گو سے کسی ایسے کردار کی داستان کا تقاضا

کرتے ہیں جو گذشتہ کسی داستان میں مر چکا ہے تو ہم گویا یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کردار کے کارنامے اور مہمات جو نئی داستان میں بیان ہوں گے، وہ دراصل اس زمانے کے ہیں جب وہ کردار زندہ تھا۔ یا پھر بعض اوقات ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ اس کردار کی موت فرضی تھی، یا اس کی موت کا بیان کسی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اور یہ تو بہر حال بالکل فطری ہے کہ ہمیں اپنے محبوب کردار کی داستان سے غرض ہو اور ہمارے لئے یہ بات اہم نہ ہو کہ کل کو ہم اس کی موت کا حال سن چکے تھے، آج یہ زندہ کیسے اور کیوں نظر آ رہا ہے؟ اسی طرح، یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ کوئی داستان گو کسی وقت میں ایسی داستان بنائے جس میں خلط زمان (Anachronism) ہو۔ اور ایسی داستان جب لکھی جائے گی تو اس کا خلط زمان تحریری روپ میں بھی موجود رہے گا۔

جدید زمانے میں ایک مثال آرتھر کانن ڈائل (Arthur Conan Doyle) کی ہے۔ شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) کے بارے میں لکھنے کے لئے روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آ کر اور اس الجھن کے باعث کہ اس کا ادبی تشخص کم و بیش شرلاک ہومز پر ہی منحصر اور محدود ہو کر رہ گیا تھا، کانن ڈائل نے ایک افسانے میں ہومز کی "موت" دکھا دی۔ لیکن شائقین نے اس بات کو اس قدر ناپسند کیا اور ہومز کے تسلسل حیات پر اتنا اصرار کیا کہ کچھ مدت بعد کانن ڈائل کو مجبور ہو کر ہومز کے "زندہ بچ جانے" کے بارے میں افسانہ لکھنا پڑا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہومز نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر از خود اپنی "موت" کا سوانگ رچا تھا۔ اس کے بعد شرلاک ہومز کی "موت" کبھی نہیں ہوئی۔ کانن ڈائل نے سراغ رسانی کے پیشے سے ہومز کے رسمی طور پر الگ ہو جانے کے بعد بھی اسے بعض معاملات میں سراغ رسانی کا کام انجام دیتے ہوئے دکھایا ہے۔

یہاں داستان امیر حمزہ سے مشابہت بالکل سامنے کی ہے: عمرو کو موت نہ آئے گی، بشرطیکہ وہ خود ہی تین بار اپنی موت نہ مانگے۔ اس کی زندگی ہی میں اس کے جانشین عمرو ثانی، پھر عمر ثالث (خضران) پیدا ہو جاتے ہیں۔ امیر حمزہ کی تقدیر میں شہادت ہے، لیکن ان کے شہید ہونے کے بہت پہلے حمزۂ ثانی ان کا بیٹا ان کا جانشین ہوتا ہے، وہ صاحبقران بھی ہے۔ حمزۂ ثانی کے بعد دوسرے (بدیع الملک، عادل کیواں شکوہ) صاحبقران بھی ہوتے ہیں جو فی الشل امیر حمزہ ہی ہیں۔

داستان امیر حمزہ طویل (نولکشوری) کے بارے میں یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ جن لوگوں کے نام سے اس کا ''ترجمہ'' یا ''تصنیف'' منسوب ہے (محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین، وغیرہ) انھوں نے اس کے مختلف اجزا جگہ جگہ سے حاصل کئے تھے اوران اجزا میں اپنی اختراع بھی شامل کی تھی۔ لیکن بعض جگہ خود ارباب پریس، جو عام حالات میں اپنے ''مصنفوں'' کو ''مترجم'' کہتے رہتے ہیں، کچھ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں کہ فیصلہ ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس داستان میں رنگ آمیزی کس کس کی اور کتنی ہے۔ مثلاً ''تورج نامہ''، جلد اول، (نولکشور، لکھنؤ ۱۹۰۶) کے بارے میں سرورق پر لکھا گیا ہے کہ پیارے مرزا نے اس داستان کو باعانت شیخ تصدق حسین ''ترجمہ'' کیا۔ یعنی شیخ تصدق حسین نے داستان کی تحریر (یا ''ترجمہ'') میں پیارے مرزا کی اعانت کی ہے۔ لہٰذا پیارے مرزا ''مترجم/مصنف'' اول ہیں۔ اس کے باوجود اسی داستان میں شیخ تصدق حسین کا اپنا دعویٰ (ص ۷۷۵) یہ ہے کہ میں ہی اس داستان کا ''مترجم'' ہوں۔ وہ کہتے ہیں، ''مجھے تو جناب منشی صاحب موصوف [منشی پراگ نرائن] کی عزت افزائی پر ناز ہے... کہ تورج نامہ کے ترجمے کو مجھ سے ارشاد کیا۔ میں نے حسب الحکم جو کچھ برا بھلا ہو سکا قلمبند کیا۔'' یعنی وہ کسی کی شراکت تو کیا، کسی کی اعانت کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ لیکن اگلے ہی صفحے (۷۷۶) پر ارباب مطبع ہمیں بتاتے ہیں کہ اس داستان کو ''منشی پیارے مرزا صاحب نے بہ استعانت داستان گوے بے نظیر... شیخ تصدق حسین صاحب... نہایت سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔''

''تورج نامہ''، جلد دوم، (نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۷) کے سرورق پر صاف لکھا ہوا ہے کہ اس داستان کو ''شاعر شیریں زبان، ناثر خوش بیان، منشی پیارے مرزا صاحب نے بہ اعانت داستان گوے بے نظیر شیخ تصدق حسین صاحب تصنیف کیا۔'' لیکن آخری صفحے پر درج ہے کہ یہ داستان ''از تالیفات... شیخ تصدق حسین صاحب'' ہے اور اسمٰعیل اثر نے اس کی ''تصحیح و ترتیب'' کی ہے۔ اب حقیقت جو کچھ بھی ہو، یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ جب اسمٰعیل اثر نے داستان کی ''تصحیح اور ترتیب'' کا کام کیا تو کچھ نہ کچھ اضافہ یا حذف تو کیا ہی ہوگا۔ اور اگر پیارے مرزا نے باعانت شیخ تصدق حسین، یا شیخ تصدق حسین نے بہ استعانت پیارے مرزا یہ داستان بنائی تو ظاہر ہے کہ دونوں نے ہی اپنی اپنی داستانیں، وقوعے، اور مناظر اس میں داخل کئے ہوں گے۔

داستان کی ''تصنیف'' یا ''ترجمہ'' کے بارے میں ارباب مطبع نے وقتاً فوقتاً کئی الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جن کے معنی ہم پر پوری طرح روشن نہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ جگہ جگہ برتے گئے ہیں:

استعانت

اعانت

تالیف

ترتیب

ترجمہ

تصحیح

تصنیف

یہ بات بہر حال ثابت ہے کہ یہ داستانیں ''فارسی سے ترجمہ'' نہیں ہیں، لیکن ہمارے داستان گویوں کو ان کا مصنف بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات بھی بالکل صاف ہے کہ داستان میں ترجمہ/تصنیف، یا تالیف/ترجمہ، یا تصحیح/ترتیب، یا استعانت/اعانت، کا تصور بہت ڈھیلا ڈھالا ہے۔ لہٰذا یہ بھی ظاہر ہے کہ جب داستان کی تشکیل کا نظام بھی خاصا ڈھیلا ڈھالا ہے تو اس کے مختلف وقوعوں اور داستانوں میں ربط اور ترتیب بس اتنی ہی ہوگی کہ بات بالکل الجھ نہ جائے۔ جدید زمانے کے لوگ جن کے ذہن میں بیانیہ کا تصور ناول کے تصور سے مربوط ہے، اس ''بے ربطی اور انتشار'' کو ناپسند کریں گے، لیکن وہ بہر حال یہ بھی چاہیں گے کہ داستانوں کی کوئی ترتیب قائم کی جائے، کیوں کہ اس طرح فرینک کرموڈ (Frank Kermode) کے الفاظ میں ''انجام و اختتام کا شعور یا احساس'' (The Sense of an Ending) حاصل ہوتا ہے۔ یعنی داستان کے بارے میں کوئی ہزار کہے کہ یہ بڑی حد تک بے آغاز اور تقریباً پوری طرح بے اختتام ہے، لیکن داستان امیر حمزہ طویل نامی اس طویل سلسلۂ داستان میں کچھ تو آغاز و اختتام کا احساس ہونا چاہیے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے گیان چند کی مجوزہ ترتیب کو دیکھا کہ انھوں نے آٹھ کی جگہ گیارہ دفاتر، اور چھیالیس داستانوں یا جلدوں کے ایک چرخ کی جگہ انتیس انتیس داستانوں کے دو چرخ مقرر

کئے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں بعض داستانیں مشترک ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب سے اچھی ترتیب وہ ہے جو واقعات قصہ کے وقوع کے اعتبار سے، یعنی chronological order کا خیال رکھ کر بنائی گئی ہو۔ گیان چند کی ترتیب میں خوبیاں ہیں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس سے داستان کی بنیادی وحدت کا تاثر درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور داستان کی جلدوں کو ترتیب زمانی کے اعتبار سے منظم کرنے کی اگر کوئی وجہ ہے تو یہی، کہ اس کے ذریعہ داستان میں ایک وحدت، اور انجام و اختتام کا احساس ہو۔ ورنہ خود داستان کی شعریات کے بموجب اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

دفاتر کی موجودہ صورت میں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے واقعات بیک وقت پیش آرہے ہیں، یا یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب پیش آئے۔ ''آفتاب شجاعت'' اور ''گلستان باختر'' میں اکثر یہ بات نظر آتی ہے کہ اگر چہ اصولاً ان داستانوں کے واقعات کو ''لعل نامہ'' کے بعد ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ ''لعل نامہ'' میں امیر حمزہ اور عمرو عیار بن امیہ ضمری، دونوں کی موت ہو جاتی ہے اور ان واقعات کو ہم داستان کا ''فطری اختتام'' کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔ اگلے پچھلے واقعات کہیں کہیں بے ترتیب نظر آتے ہیں۔ ''لعل نامہ'' کے بعد اصولاً کچھ نہیں ہے، لیکن خود ''لعل نامہ'' میں بعض واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وقوع ''تورج نامہ'' کا ہم زمان ہے (''لعل نامہ''، جلد اول، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۳، ص ۴۲ اور اس کے آگے)۔ لیکن جلد دوم (نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۷، ص ۵۵۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ ''آفتاب شجاعت'' کے بہت سے واقعات ابھی پیش نہیں آئے ہیں۔ اسی طرح، صحیح ترتیب کے حساب سے ''طلسم ہوش ربا'' بہت بعد میں ہے اور ''ہرمز نامہ'' بہت پہلے، لیکن ''ہرمز نامہ'' (نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۰۰) ص ص ۳۳۶، ۷۹۳، ۸۰۶، ۸۲۱، وغیرہ پر ''طلسم ہوشربا'' کا ذکر یوں ہے گویا اس کے واقعات پیش آچکے ہوں۔

میرا کہنا ہے کہ ان سب خلط زمانیوں کے باوجود ایسی ترتیب ممکن ہے جس میں دفاتر کا موجودہ نظام (یعنی آٹھ دفتروں کا سلسلہ) برقرار رہے، اور واقعات کے دونوں دھارے، یعنی ایک وہ جو شیخ تصدق حسین کا بیان کردہ ہے، اور دوسرا وہ جو احمد حسین قمر کا بیان کردہ ہے، اس طرح جوڑ دیئے جائیں کہ داستان عمومی طور پر concurrent اور یک زمانی نہ رہ کر consecutive اور دو زمانی، یعنی diachronic ہو جائے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ ہر جلد اپنی جگہ پر ایسی بیٹھے کہ تمام خلط زمانی دور ہو جائے اور کڑی

سے کڑی اس طرح مل جائے کہ بالکل مسطح اور دھچکوں سے پاک بیانیہ تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اپنی شعریت کے اعتبار سے داستان کی نوعیت ایسی ہے ہی نہیں۔ بس اتنا ہوگا کہ ہر جلد گذشتہ اور فوری طور پر آئندہ جلد سے مربوط ہوگی، اور اہمیت داستان گو کو نہیں، بلکہ داستان کو حاصل ہوگی۔

ملحوظ رہے کہ اس نئی ترتیب میں دفتروں کی کوئی خاص اہمیت نہ رہ جائے گی۔ اب اہمیت الگ الگ داستانوں کی ہوگی۔ بلکہ یوں کہیے کہ داستان کی کوئی بھی زمانی ترتیب قائم کی جائے گی تو دفتروں کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اس وقت بھی دفتر ایک مصنوعی ترتیب کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ جب آپ نئی ترتیب بنائیں گے تو پرانی ترتیب لامحالہ کالعدم ہو جائے گی۔ اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ خود ارباب پریس کے بھی ذہن میں یہ بات شاید ہ اف نہیں تھی کہ "دفتر" سے کیا مراد لی جائے۔ کبھی کبھی وہ "جلد" اور "دفتر" کو ہم معنی طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ارباب پریس نے کچھ یہ طریقہ بھی اختیار کیا تھا کہ جس جلد کو بآسانی کسی دفتر میں جگہ نہ مل سکے، اسے دفتر ہشتم میں ڈال دیا جائے۔ گویا دفتر ہشتم ایک کشکول جیسا تھا کہ اس میں مختلف اشیا ڈالی جا سکتی تھیں جن کا آپسی ربط بہت زیادہ نہ تھا لیکن وہ ایک دوسری سے بالکل متغائر بھی نہ تھیں۔

اس تمہید کے بعد میری مجوزہ ترتیب ملاحظہ ہو:-

(۱) نوشیرواں نامہ، اول

(۲) ہومان نامہ

(۳) نوشیرواں نامہ، دوم

(۴) ہرمز نامہ

(۵) کوچک باختر

(٦) بالا باختر

(۷) ایرج نامہ، اول

(۸) ایرج نامہ، دوم

(۹) طلسم ہوش ربا، اول

(۱۰) طلسم ہوش ربا، دوم

(۱۱) طلسم ہوش ربا، سوم

(۱۲) بقیہ طلسم ہوش ربا، اول

(۱۳) بقیہ طلسم ہوش ربا، دوم

(۱۴) طلسم ہوش ربا، چہارم

(۱۵) طلسم ہوش ربا، پنجم، اول

(۱۶) طلسم ہوش ربا، پنجم، دوم

(۱۷) طلسم ہوش ربا، ششم

(۱۸) طلسم ہوش ربا، ہفتم

(۱۹) طلسم فتنہ نور افشاں، اول

(۲۰) طلسم فتنہ نور افشاں، دوم

(۲۱) طلسم فتنہ نور افشاں، سوم

(۲۲) طلسم ہفت پیکر، اول

(۲۳) طلسم ہفت پیکر، دوم

(۲۴) طلسم ہفت پیکر، سوم

(۲۵) طلسم خیال سکندری، اول

(۲۶) طلسم خیال سکندری، دوم

(۲۷) طلسم خیال سکندری، سوم

(۲۸) طلسم نوخیز جمشیدی، اول

(۲۹) طلسم نوخیز جمشیدی، دوم

(۳۰) طلسم نوخیز جمشیدی، سوم

(۳۱)طلسم زعفران زار سلیمانی، اول

(۳۲)طلسم زعفران زار سلیمانی، دوم

(۳۳)صندلی نامہ

(۳۴)تورج نامہ، اول

(۳۵)تورج نامہ، دوم

(۳۶) آفتاب شجاعت، اول

(۳۷) آفتاب شجاعت، دوم

(۳۸) آفتاب شجاعت، سوم

(۳۹) آفتاب شجاعت، چہارم

(۴۰) آفتاب شجاعت، پنجم، اول

(۴۱) آفتاب شجاعت، پنجم، دوم

(۴۲) گلستان باختر، اول

(۴۳) گلستان باختر، دوم

(۴۴) گلستان باختر، سوم

(۴۵)لعل نامہ، اول

(۴۶)لعل نامہ، دوم

وہ دلائل وحقائق جو اس ترتیب کو متعین کرنے میں معاون ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱)نوشیرواں نامہ، اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۲)ہومان نامہ: داستان گو، احمد حسین قمر

(۲)نوشیرواں نامہ، دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

''نوشیرواں نامہ'' کم وبیش سارے کا سارا داستان (مختصر) کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دونوں جلدوں کی طوالت اور داستان (مختصر) کے اختصار کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ ''نوشیرواں نامہ'' میں مختصر داستان کے بہت سے واقعات اور کردار بہت پھیلا کر بیان کئے گئے ہیں، اور بعض نئے وقوعے اور مناظر بھی جوڑے گئے ہیں۔ ''ہومان نامہ'' کے کئی واقعات اور کرداروں کی مہمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں ''نوشیرواں نامہ'' اول کے بعد کی تو ہیں لیکن ''نوشیرواں نامہ'' جلد دوم کے اختتام کے پہلے وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ اگر داستان گویوں نے ''ہومان نامہ'' نام نہ اختیار کیا ہوتا تو اسے بآسانی ''نوشیرواں نامہ'' کی ایک جلد (یا جلد اول کا دوسرا حصہ) کہہ سکتے تھے۔

''نوشیرواں نامہ'' جلد اول میں نوشیرواں کی پیدائش اور شادی، امیر حمزہ کی پیدائش اور پردۂ دنیا سے ان کا پردۂ قاف پر اٹھوالیا جانا، اور وہاں شاہ پردۂ قاف کی بیٹی آسمان پری سے امیر کا منسوب ہونا بیان ہوا ہے۔ علاوہ بریں، ان میں عمرو عیار کی پیدائش، امیر حمزہ کا نوشیرواں کی بیٹی مہر نگار کے عشق میں مبتلا ہونا، امیر کا سراندیپ جانا اور لندھور بن سعدان خسرو ہندوستان کو نوشیرواں کی طرف سے اپنا مطیع کرنا مذکور ہے۔ شاہ یونان کی بیٹی ناہید مریم [اس کا نام گلشن آرا بھی کہیں کہیں ملتا ہے] کے بطن سے امیر حمزہ کے بیٹے عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش (جلد اول)، اور ملکہ رابعہ اطلس پوش رومی کے بطن سے امیر حمزہ کے بیٹے (رستم) علم شاہ کی پیدائش ہوتی ہے (جلد دوم)۔ مہر نگار کے بطن سے قباد شہر یار، اور گردیہ بانو کے بطن سے بدیع الزماں بھی امیر کے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ان جلدوں میں امیر حمزہ کا پردۂ قاف میں اٹھارہ برس تک مقیم رہنا، آسمان پری سے ان کی شادی، اور پردۂ قاف میں ان کے مہمات ومصائب کا تذکرہ ہے۔

بدیع الزماں کی ماں گردیہ بانو کے بطن سے امیر کی واحد آدمی زاد بیٹی زبیدہ شیر دل پیدا ہوتی ہے۔ ادھر پردہ قاف پر آسمان پری کے بطن سے امیر حمزہ کی واحد پری زاد بیٹی قریشہ سلطان [کہیں کہیں اس کا نام قریشہ سلطان بھی درج ہے] پیدا ہو چکی ہوتی ہے، لیکن آسمان پری سے پھر کوئی اولاد نہیں ہوتی۔

قباد کو شہر یار افواج اسلامیان کا بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ گلیم پوش عیار دھوکے سے قباد کو قتل کر دیتا ہے۔ مہر نگار اس غم میں خودکشی کر لیتی ہے۔ امیر حمزہ فرط غم سے تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور دشمنوں کا پنجہ

ان پر قابض ہو جاتا ہے۔ عمرو بڑی مشکل سے انھیں چھڑالاتا ہے۔ اس درمیان بختیارک وزیر کی شہ پا کر نوشیرواں کے بیٹے ہرمز اور فرامرز نوشیرواں کو تخت سے اتار دیتے ہیں (''نوشیرواں نامہ، دوم، ص ۷۹۹)۔ ادھر نوشیرواں کے تعاقب میں امیر حمزہ کشمیر جاتے ہیں۔

''ہومان نامہ'' میں قباد شہریار، شاہ اسلامیان اور مہر نگار کی موت کی داستانیں نئے رنگ سے اور نئے سرے سے بیان ہوئی ہیں۔ ''نوشیرواں نامہ'' دوم کے بعض واقعات میں ''ہومان نامہ'' کی پیش آمد ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۰ پر ہومان پہلی بار داستان میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ملک دمشق کے شکست خوردہ حاکم ہام دمشقی کی حیثیت سے امیر حمزہ کے سامنے لایا جاتا ہے۔ ''نوشیرواں نامہ''، جلد دوم، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۱۵ میں صفحہ ۲۰ پر مذکور ہے:

> ایک خواجہ سرا [ایک] لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے امیر با توقیر کے سامنے لایا اور عرض کیا کہ ہومان اس کا نام ہے، اور ہام دمشقی کا یہ بیٹا ہے۔ امیر اس لڑکے پر بر سر رحم ہوئے اور ملک اس کے باپ کا اور اس کے چچا کا اس لڑکے کو دیا اور وزیروں سے اس کے کہا کہ اس لڑکے کی اچھی طرح پرورش کرنا۔ عمرو نے امیر با توقیر سے کہا کہ اس لڑکے سے خوف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے آزار پہنچیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ اس کو بھی قتل کرڈالیے۔ امیر با توقیر نے فرمایا کہ خلاف شرع میں نہ کروں گا، کس واسطے کہ یہ لڑکا بے خطا اور یتیم ہے۔

اس وقوعے کے تھوڑی دیر بعد امیر حمزہ کو مہر نگار سے خفگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مہر نگار کو اپنی نظروں سے دور ہو جانے کو کہتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی احمد حسین قمر نے نئے رنگ سے ''ہومان نامہ'' میں لکھا ہے۔ ''ہومان نامہ'' کے اختتام پر احمد حسین قمر کہتے ہیں کہ اس داستان کا سرا ''نوشیرواں نامہ'' سے ملایا جائے گا۔ ''ہومان نامہ'' کا ایک اہم ساحر ثمرات سخن گو، جسے دعوائے خدائی ہے، ''نوشیرواں نامہ'' دوم میں پہلی بار نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ''ہومان'' اور 'نوشیرواں'' میں کئی داستانیں، یا واقعات (مثلاً قباد کی موت) مشترک بھی ہیں اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دونوں داستانوں کے اکثر واقعات یک زمان یعنی Synchronic ہیں۔ ارباب مطبع نے ''ہومان نامہ'' کو متعلقات ''نوشیرواں نامہ'' لکھا ہے۔

## (۴) ہرمز نامہ: داستان گو، شیخ تصدق حسین

صاحبان مطبع نے اسے بھی ''متعلقات نوشیرواں نامہ'' لکھا ہے۔ نوشیرواں کے بیٹوں ہرمز اور فرامرز اور امیر حمزہ کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جو ''ہومان نامہ'' اور ''نوشیرواں نامہ''، دوم، کے بڑے حصے پر پھیلا ہوا تھا، یہاں بھی جاری رہتا ہے۔ نوشیرواں کی موت اس جلد کے شروع میں ہو جاتی ہے (ص ۱۰)۔ ''ہومان'' کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ بعد کے واقعات ''نوشیرواں نامہ'' جلد دوم میں ہیں، اور ''نوشیرواں نامہ'' دوم کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ بعد کے واقعات ''ہرمز نامہ'' میں بیان ہوئے ہیں۔

دوسری جلدوں کے برخلاف، ''ہرمز نامہ'' کے اختتام میں وہ صفائی اور آئندہ داستانوں سے اس کا ربط مذکور نہیں ہے جو عام طور پر داستان طویل کی دیگر جلدوں کا خاصہ ہے۔ ہرمز اور فرامرز پر امیر حمزہ کو مکمل فتح حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ لقا، عرف زمرد شاہ، جس کو دعوائے خدائی ہے، اور جس سے امیر حمزہ کی جنگیں کئی جلدوں میں مذکور ہیں، پہلی بار اسی جلد میں سامنے آتا ہے۔

## (۵) کوچک باختر: داستان گو، شیخ تصدق حسین

## (۶) بالا باختر: داستان گو، شیخ تصدق حسین

ان دونوں جلدوں کی داستانیں ''ہومان'' اور ''ہرمز'' کے سلسلے کی ہیں۔ ہرمز اور فرامرز یہاں موجود ہیں۔ ''کوچک'' کے آخر میں ہم بدیع الزماں بن حمزہ کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک طلسم میں داخل ہونے والا ہے۔ ''بالا'' کے آغاز میں ہم اسے اس طلسم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لقا کا مزید تذکرہ ''کوچک'' اور ''بالا'' میں ہے۔

''بالا'' کے اختتام پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایرج بن قاسم بن رستم علم شاہ بن حمزہ اور اس کے عیار شاپور بن عمرو کی پیدائش کو نو یا دس سال گذر چکے ہیں۔ لقا کو شکست ہوتی ہے تو وہ بھاگ کر عطلی آباد میں زردہشت کی ''خدائی'' میں پناہ لیتا ہے۔ ''ایرج نامہ''، جلد اول، کے آغاز میں ہم لقا کو عطلی آباد میں دیکھتے ہیں۔

## (۷) ایرج نامہ، اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

## (۸) ایرج نامہ، دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

''بالا باختر'' کا اختتام ہوتے وقت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایرج بن قاسم اور اس کے عیار شاپور بن عمرو عیار کی پیدائش کو نو یا دس سال گذر چکے ہیں۔ کافروں کے خداوند لقا کو امیر حمزہ اور لندھور وغیرہ کے ہاتھوں شکست ہوتی ہے تو لقا عنطلی آباد میں پناہ لیتا ہے۔ ''ایرج نامہ''، جلد اول کے شروع میں لقا کو ہم عنطلی آباد میں دیکھتے ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں ایرج اور شاپور کے کارنامے نمایاں ہیں۔

## (۹) طلسم ہوشربا، جلد اول: داستان گو، محمد حسین جاہ

## (۱۰) طلسم ہوشربا، جلد دوم: داستان گو، محمد حسین جاہ

## (۱۱) طلسم ہوش ربا، جلد سوم: داستان گو، محمد حسین جاہ

## (۱۲) بقیہ طلسم ہوش ربا، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۱۳) بقیہ طلسم ہوش ربا، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

''ایرج نامہ''، جلد دوم کے آخر میں لقا اور اس کے ساتھیوں کو مسلسل شکستیں ہوتی ہیں۔ لقا آخر کار شہنشاہ جادواں افراسیاب کے ملک طلسم ہوش ربا کے پاس کوہ عقیق گلزار سلیمانی میں پناہ لیتا ہے اور افراسیاب سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ لقا کا تعاقب کرتے کرتے امیر حمزہ کوہ عقیق گلزار سلیمانی کے قریب طلسم ہوش ربا کی سرحد پر پہنچتے ہیں۔ وہاں بدیع الزماں بن حمزہ کو افراسیاب دوران شکار گرفتار کر لیتا ہے، کیونکہ بدیع الزماں ایک آہو کا پیچھا کر رہا تھا اور جب وہ اسے زندہ گرفتار نہ کر سکا تو اسے تیر سے زخمی کر کے ذبح کر ڈالتا ہے۔ وہ آہو دراصل سرحد دار طلسم غزال جادو نامی تھا۔ افراسیاب کو اس واقعے کی فوراً خبر پہنچتی ہے اور وہ بدیع الزماں کو بیہوش کر کے طلسم ہوش ربا کے اندر اٹھوا منگا تا ہے اور بدیع الزماں کی شکل کا پتلا بنا کر صحرا میں چھوڑ دیتا ہے۔ فرزندان خواجہ بزرجمہر اپنے علم سے بتا دیتے ہیں کہ بدیع الزماں کی موت نہیں

ہوئی ہے، وہ صرف زندانی شہنشاہ طلسم ہے۔ اب بدیع الزماں کو آزاد کرانے کی تدابیر شروع ہوتی ہیں۔

بنیادی طور پر داستان ''طلسم ہوش ربا'' بدیع الزماں کو آزاد کرانے کی کوششوں اور لقا/ سلیمان عنبریں موے کو ہی/ افراسیاب کے پہلوانوں اور افواج، اور امیر حمزہ کے پہلوانوں اور افواج کے درمیان معرکوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں سحر و ساحری اور عیاری بھی کا بھی بہت بڑا عنصر ہے۔ بالآخر لقا اور امیر کے درمیان جنگوں کے عنصر پر خود طلسم ہوش ربا کے اندر طلسمی اور غیر طلسمی جنگوں اور دونوں طرف کی عیاریوں کے عناصر غالب آجاتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امیر حمزہ کے نواسے اسد کو افراسیاب کی بھانجی مہ جبیں سے عشق ہو جاتا ہے اور افراسیاب دونوں کو قید کر دیتا ہے۔

''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' کی دو جلدیں احمد حسین قمر نے بہت بعد میں لکھیں۔ ان جلدوں میں کوئی مسلسل داستان نہیں، بلکہ الگ الگ واقعات و مناظر (Episode) اور وقوعے (Event) ہیں جن میں سے زیادہ تر کا تعلق ''طلسم ہوش ربا'' جلد اول تا جلد سوم کی داستانوں سے ہے۔ کچھ کا تعلق جلد چہارم سے بھی نظر آتا ہے، لیکن عمومی طور پر ''بقیۂ طلسم ہوش ربا'' کے واقعات اسی دوران کے ہیں جب جلد اول سوم کے واقعات پیش آرہے تھے۔

(۱۴) طلسم ہوش ربا، جلد چہارم: داستان گو، محمد حسین جاہ

(۱۵) طلسم ہوش ربا، جلد پنجم، حصۂ اول: داستان گو، احمد حسین قمر

(۱۶) طلسم ہوش ربا، جلد پنجم، حصۂ دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

(۱۷) طلسم ہوش ربا، جلد ششم: داستان گو، احمد حسین قمر

(۱۸) طلسم ہوش ربا، جلد ہفتم: داستان گو، احمد حسین قمر

ان جلدوں میں افراسیاب/ لقا اور امیر حمزہ کی افواج و عیاران کے مابین معرکوں کے بیان کے علاوہ کوکب روشن ضمیر، بادشاہ طلسم نور افشاں اور اس کی بیٹی بران تیغ زن کا بھی مفصل حال ہے کہ وہ لوگ کس کس طرح امیر حمزہ، بدیع الزماں اور دیگر اسلامیوں کی مدد کرتے ہیں۔ اسد اور مہ جبیں کی رہائی

بھی واقع ہوتی ہے۔ بالآخر افراسیاب کو شکست ہوتی ہے اور وہ امیر حمزہ کے نواسے اسد بن کرب کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ امیر حمزہ کی دو ہی بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی قاف کی شہزادی آسمان پری کے بطن سے ہے، اس کا نام قریشہ یا قریشیہ سلطان ہے۔ دوسری بیٹی زبیدہ شیر دل ہے جس کی ماں کا نام گردیہ بانو ہے۔ اسد کی ماں یہی زبیدہ شیر دل ہے۔

## (۱۹) طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۰) طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۱) طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد سوم،: داستان گو، احمد حسین قمر

''طلسم ہوش ربا''، جلد ہفتم کے وسط میں عظیم جادوگر نور افشاں کی موت واقع ہوتی ہے۔ وہ طلسم نور افشاں کے بادشاہ کوکب روشن ضمیر کے استاد کی حیثیت سے بھی طلسم نور افشاں کا نہایت محترم رکن ہے۔ مرنے سے پہلے وہ آئندہ واقعات کی خبر دیتا ہے۔ اس کی پیشین گوئیوں میں فتنۂ نور افشاں کی طرف اشارہ ہے کہ براں بنت کوکب روشن ضمیر اور ایرج بن قاسم بن رستم بن حمزہ کے درمیان محبت اور مناکحت کو نامنظور کرنے کے باعث کوکب روشن ضمیر اور امیر حمزہ کی فوجوں کے درمیان خانہ جنگی ہوگی۔ داستان کے آخر میں داستان گو ہمیں بتاتا ہے کہ ہوش ربا کی تسخیر کے بعد امیر حمزہ کی افواج طلسم نور افشاں کو زیر نگیں کریں گی۔ اس طرح ''طلسم ہوش ربا'' کے کچھ واقعات کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر چند ''طلسم فتنۂ نور افشاں'' کے کچھ واقعات اور ''طلسم ہوش ربا''، جلد ہفتم، کے کچھ کچھ واقعات میں یک زمانی (synchronicity) ہے لیکن ''طلسم فتنۂ نور افشاں'' کے بیشتر واقعات ''طلسم ہوش ربا'' کے بعد پیش آتے ہیں۔

## (۲۲) طلسم ہفت پیکر، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۳) طلسم ہفت پیکر، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۴) طلسم ہفت پیکر، جلد سوم: داستان گو، احمد حسین قمر

یہ طلسم اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے بادشاہ ہفت پیکر کے محل میں سات درجے ہیں اور ہر درجہ ایک ملک کے برابر ہے۔ طلسم نورافشاں کے دو خیرہ سر بادشاہ جن کے نام مصر الغرائب اور سحر العجائب تھے، امیر حمزہ کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔ سحر العجائب بھاگ کر ہفت پیکر میں پناہ لیتا ہے۔ قاسم بن رستم علم شاہ بن حمزہ اور لندھور بن سعدان اس کے تعاقب میں ہیں اور طلسم ہفت پیکر میں قید کر لئے جاتے ہیں۔ شاہ اسلامیان سعد بن قباد انھیں دونوں کی رہائی کے مقصد سے خیام امیر حمزہ کو چھوڑ کر ''طلسم نورافشاں'' جلد سوئم کے آخری صفحات میں چپکے سے طلسم ہفت پیکر کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ احمد حسین قمر نے ''طلسم نورافشاں'' میں مختلف جگہوں پر لکھا ہے کہ ''طلسم نورافشاں'' کے بعد ''طلسم ہفت پیکر'' کی داستانیں ہیں۔ ہفت پیکر کی موت پر تیسری جلد تمام ہوتی ہے۔

## (۲۵) طلسم خیال سکندری، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۶) طلسم خیال سکندری، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۷) طلسم خیال سکندری، جلد سوم: داستان گو، احمد حسین قمر

''طلسم ہفت پیکر''، جلد سوم کے آخر میں حکیم خیال سکندری کا ظہور ہوتا ہے۔ ''طلسم خیال سکندری''، جلد اول میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ حکیم خیال سکندری کے مقبرے پر حکیم ارسطو نے ایک طلسم ترتیب دیا تھا۔ اس کا نام ''طلسم خیال سکندری'' ہے اور نورالدہر بن بدیع الزماں بن حمزہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوتا ہے۔

## (۲۸) طلسم نوخیز جمشیدی، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۲۹) طلسم نوخیز جمشیدی، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر

## (۳۰) طلسم نوخیز جمشیدی، جلد سوم: داستان گو، احمد حسین قمر

ابھی نورالدہر نے طلسم خیال سکندری کو فتح نہ کیا تھا کہ امیر حمزہ کی پری زاد بیوی آسمان پری

اسے پردۂ قاف پر اٹھوالاتی ہے۔ یہاں جمشید ثانی کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ جمشید ثانی کے باپ جمشید، اور چچا سامری کی موت کے بعد جمشید ثانی نے خدائی اور بادشاہی اختیار کی ہے۔ اس نے آسمان پری اور امیر حمزہ سے اس کی بیٹی قریشہ (اس کا نام کئی داستانوں میں "قریشہ سلطان بھی ہے) کو طلسم نوخیز جمشیدی میں قید کر رکھا ہے۔ نورالدہر وہاں آتو جاتا ہے لیکن آسمان پری نے اپنی جلد بازی اور رعونت کی بنا پر کاہنوں سے یہ بھی نہیں معلوم کیا تھا کہ طلسم نوخیز جمشیدی کی فتاحی کس کی تقدیر میں لکھی ہے۔ عبدالرحمٰن جنی آسمان پری کا وزیر اور کاہن ہے۔ نورالدہر کی آمد کے بعد عبدالرحمٰن کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ طلسم نوخیز جمشیدی کے فتاح تو دراصل شاہ اسلامیان ہیں۔ لہٰذا اسعد بن قباد، شاہ اسلامیان، بھی وہاں پہنچ کر مصروف جنگ ہوتا ہے۔ قاسم بن رستم علم شاہ بھی وہاں نام اور عزت کی خاطر وہاں پہنچ کر اپنے طور پر مصروف تلاش و جنگ ہوتا ہے۔ بالآخر جمشید ثانی جنگ میں سعد کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

## (۳۱) طلسم زعفران زار سلیمانی، جلد اول: داستان گو، احمد حسین قمر اور شیخ تصدق حسین

## (۳۲) طلسم زعفران زار سلیمانی، جلد دوم: داستان گو، احمد حسین قمر اور شیخ تصدق حسین

"طلسم نوخیز جمشیدی"، جلد دوم میں جمشید ثانی ایک موقعے پر کہتا ہے کہ میں حمزہ کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں، طلسم زعفران زار سلیمانی کو چلا جاؤں گا۔ "طلسم نوخیز جمشیدی"، جلد سوم کے آخر میں طلسم زعفران زار سلیمانی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس طلسم کا حاکم شدکال دیو پرور ہے۔ اس کی موت داستان کے آخر میں واقع ہوتی ہے۔

## (۳۳) صندلی نامہ: داستان گو، اسمٰعیل اثر

اس جلد میں امیر حمزہ کے بیٹے حمزۂ ثانی کا ظہور ہوتا ہے۔ حمزۂ ثانی کو بانہ ہائے صاحب قرانی حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا عیار بھی عمرو عیار کا بیٹا ثابت ہوتا ہے اور عمرو ثانی کہلاتا ہے۔ چونکہ اب تک کی

جلدوں میں حمزۂ ثانی یا صاحب قران ثانی کا وجود نہ تھا، اس لئے ''صندلی نامہ'' پوری داستان میں ایک خط فاصل یا Watershed کی سی بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور چونکہ اب سے پہلے حمزۂ ثانی کا وجود منظر عام پر نہ آیا تھا، اور گذشتہ تمام جلدیں آپس میں مربوط ہیں، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''صندلی نامہ'' کو ''طلسم زعفران زار سلیمانی'' کے بعد رکھا جانا چاہئے۔

محمد حسین جاہ کے یہاں (یعنی ''طلسم ہوش ربا''، جلد اول تا چہارم میں) حمزۂ ثانی کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ ہاں احمد حسین قمر کی لکھی ہوئی داستانوں میں یہ تاثر ملتا ہے کہ امیر حمزہ بن عبد المطلب ہی صاحب قراں ہو سکتے ہیں۔ ان کی اولادیں اس منصب کی دعوے دار تو ہوتی ہیں، لیکن کامیاب کوئی نہیں ہوتا۔

''طلسم نوخیز جمشیدی'' کی تکمیل کے بعد احمد حسین قمر نے ''طلسم زعفران زار سلیمانی'' لکھنا شروع کی۔ لیکن اس کی تحریر کے دوران ہی ان کا انتقال ہو گیا (۱۹۰۱)۔ جاہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا (غالباً ۱۸۹۴)۔ احمد حسین قمر نے ''طلسم زعفران زار سلیمانی'' کی ایک جلد مکمل کی تھی اور دوسری جلد کے لئے وہ کچھ نامکمل مسودہ چھوڑ گئے تھے۔ اب زمام کار شیخ تصدق حسین کے ہاتھ آئی۔ انھوں نے ''طلسم زعفران زار سلیمانی'' کو مکمل کیا۔ اس دوران، اسمٰعیل اثر نے ''صندلی نامہ'' لکھ ڈالی تھی (۱۸۹۵)، یعنی حمزۂ ثانی کا ظہور ہو چکا تھا۔ اب یا تو شیخ تصدق حسین نے اس ایجاد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی داستانوں میں صاحبقرانی کو دست بدست آنے والی چیز کے طور پر پیش کیا، یا پھر داستان کی اصل روایت ہی یہ تھی [یا کم سے کم اتنا کہیں کہ داستان کی ایک روایت یہ بھی تھی] کہ امیر حمزہ کے علاوہ ان کی اولادوں میں بھی صاحب قرانی ہو۔ چونکہ ''رموز حمزہ'' اور ''زبدۃ الرموز'' میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں جہاں داستان امیر حمزہ نے بہت سی نئی نئی چیزیں اور وسعتیں حاصل کر لیں، وہاں یہ بات بھی حاصل کر لی ہو کہ صاحب قرانی دراصل ایک ادارہ ہے، اور یہ ادارہ امیر حمزہ کی اولادوں کو مرضی قدرت کے مطابق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ''صندلی نامہ'' کا ذکر پہلی مرتبہ ''طلسم ہوشربا''، جلد ہفتم، میں آیا ہے اور ''طلسم ہوشربا'' کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا طلسم ہندوستانی داستان گویوں کا نتیجۂ فکر ہے۔

(۳۴) تورج نامہ، جلد اول: داستان گو، پیارے مرزا باعانت شیخ تصدق حسین

(۳۵) تورج نامہ، جلد دوم: داستان گو، پیارے مرزا باعانت شیخ تصدق حسین، و بہ ترتیب و تصحیح اسمٰعیل اثر

شروع داستان ہی میں کہہ دیا گیا ہے کہ اس داستان کا سلسلہ ''صندلی نامہ'' سے ملتا ہے۔ ''ایرج نامہ'' میں بھی ''تورج نامہ'' کی پیش آمد ہے۔ ''صندلی نامہ'' میں زیادہ تر حمزۂ ثانی کے کارنامے مرقوم ہیں۔ بدیع الملک بن بدیع الزماں بن حمزۂ اول یہاں پہلی بار نظر آتے ہیں۔ بدیع الملک کو بالآخر صاحب قرانی عطا ہو گی لیکن اس میں ابھی دیر ہے۔ اس داستان میں تورج کا ذکر برائے نام ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل (فارسی اور زبانی) داستان میں ''تورج نامہ'' کوئی مختصر سی ذیلی داستان تھی۔ اس کو وسعت دے کر ہمارے اردو داستان گویوں نے ایک طویل داستان بنا ڈالی۔

(۳۶) آفتاب شجاعت، جلد اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۳۷) آفتاب شجاعت، جلد دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۳۸) آفتاب شجاعت، جلد سوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۳۹) آفتاب شجاعت، جلد چہارم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۴۰) آفتاب شجاعت، جلد پنجم، حصۂ اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

(۴۱) آفتاب شجاعت، جلد پنجم، حصۂ دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

''تورج نامہ''، جلد دوم، کے بالکل آخر میں داستان گو نے اطلاع دی ہے کہ اب طلسم آبگینۂ ثانی کی باری ہے، اور اس طلسم کی داستان کا نام ''آفتاب شجاعت'' ہے۔ ''آفتاب شجاعت'' میں زیادہ تر

بدیع الملک (صاحب قران ثالث) کے کارنامے ہیں۔ ان کی اکثر جنگیں اکوان تاجدار سے ہوتی ہیں اکوان تاجدار کو دعوائے خدائی ہے اور اس کا بھائی ایوان تاجدار طلسم نہ طاق کا حاکم ہے۔ اکوان کو شکست اور موت نصیب ہوتی ہے، لیکن وہ دوبارہ زندہ ہو کر قتل وخون کا بازار گرم کرتا ہے۔ بدیع الملک اپنی فوج اور زیادہ تر ساتھیوں کو بیابان کاج وباج میں چھوڑ کر خانۂ کعبہ کو روانہ ہو جاتے ہیں جہاں حمزۂ اول کو ان کی ضرورت ہے۔ بدیع الملک کو صاحب قرانی مل چکی ہے (اگر چہ اس کی تفصیلات ''گلستان باختر'' جلد اول میں مندرج ہوئی ہیں)۔ خضران بن عمرو ثانی کو عمرو ثالث کا لقب، اور عمرو اول کے بانہ ہائے عیاری مل چکے ہیں۔ لیکن اس کی تفصیلات ''گلستان باختر''، جلد اول میں بیان ہوئی ہیں۔

## (۴۲) گلستان باختر، جلد اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

## (۴۳) گلستان باختر، جلد دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

## (۴۴) گلستان باختر، جلد سوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

نول کشور پریس کی قدیمی فہرستوں میں لکھا ہے کہ ''گلستان باختر'' متعلقات ''آفتاب شجاعت'' میں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں داستانیں ایک کے بعد ایک ہیں، اور ''گلستان باختر'' اور ''آفتاب شجاعت'' میں کہیں کہیں ایسے واقعات ہیں جو یک زمان (Synchronous) ہیں، یا ''گلستان باختر'' کے کچھ واقعات ایسے ہیں جنھیں ''آفتاب شجاعت'' میں ہونا چاہئے تھا۔ بہر حال، ''آفتاب شجاعت''، جلد پنجم، حصۂ اول کے وسط میں ''گلستان باختر'' کے واقعات کی پیش آمد بھی ہے اور مجموعی حیثیت اس داستان کی یہی ہے کہ ساری کی ساری داستان نہیں تو اس کا بیشتر حصہ ''آفتاب شجاعت'' کے بعد کا ہے۔ بدیع الملک کے ساتھیوں پر اکوان تاجدار کے خلاف جنگی مہمات میں بڑے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ پھر عادل کیواں شکوہ صاحب قران پنجم بنتے ہیں اور اکوان وایوان کے خلاف ان کی جنگیں جاری رہتی ہیں۔ بدیع الملک ابھی خانہ کعبہ کے راستے ہی میں ہیں۔ ادھر عادل کیواں شکوہ کو اپنی موت کا خیال آنے لگتا ہے اور انھیں محسوس ہوتا ہے کہ تیمور بن ایرج بن قاسم بن رستم علم شاہ بن حمزۂ اول کو اگلا صاحب قراں بننے کی سعادت ملے گی۔ طلسم نہ طاق کو بالآخر فتح کر لیا جاتا ہے۔ حمزۂ ثانی، جنھیں

ہم نے بہت مدت سے نہیں دیکھا تھا، اس داستان میں نظر آتے ہیں، لیکن وہ بھی عازم کعبہ ہیں۔

## (۴۵) لعل نامہ، جلد اول: داستان گو، شیخ تصدق حسین

## (۴۶) لعل نامہ، جلد دوم: داستان گو، شیخ تصدق حسین

داستان گو نے ''لعل نامہ'' کو داستان امیر حمزہ کا آخری دفتر بتایا ہے۔ ''لعل نامہ'' کی پیش آمد ہمیں ''تورج نامہ'' ہی میں نظر آتی ہے۔ ''لعل نامہ'' میں داستان امیر حمزہ کے تقریباً سب بڑے کرداروں کی موت واقع ہوتی ہے۔ ''لعل نامہ'' اگرچہ داستان کے طور پر تمام گذشتہ جلدوں کی داستانوں کے بعد ہے، لیکن اس داستان کے بعض واقعات، اور ''گلستان باختر''، جلد اول اور جلد دوم میں دو مقامات ایسے ہیں جہاں گمان گذرتا ہے کہ حمزۂ اول اور حمزۂ ثانی کی موت ہو چکی ہے۔ اسی طرح، ''لعل نامہ'' کے بعض واقعات پر خیال ہوتا ہے کہ ''آفتاب شجاعت'' کے سب واقعات ابھی پیش نہیں آئے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''آفتاب شجاعت''، ''گلستان باختر''، اور ''لعل نامہ'' کے بعض معاملات بیک وقت پیش آتے ہیں، یعنی وہ یک زمان (Synchronous) ہیں۔

''آفتاب شجاعت''، اول، ص ص ۵۸۲، ۸۰۶ پر کچھ اس طرح کا انداز بیان ملتا ہے گویا ''لعل نامہ'' [قصے کی ترتیب کے لحاظ سے آخری داستان، سال اشاعت ۱۸۹۶، ۱۸۹۷] اور ''آفتاب شجاعت''، اول، [۱۹۰۱] کے بھی کچھ واقعات یک زمان ہیں۔ ''آفتاب شجاعت''، سوم [۱۹۰۴]، ص ۲۰۹ پر داستان گو مداخل ہو کر کہتا ہے کہ بقیہ حالات اس وقت سنائے جائیں گے جب طلسم نہ طاق کی فتح کے حالات بیان ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ طلسم نہ طاق کی فتحی کے حالات ''گلستان''، جلد سوم میں مذکور ہیں۔ اس سے بھی یہ خیال گذرتا ہے کہ ''آفتاب شجاعت'' اور ''گلستان باختر'' کے کچھ واقعات اور ''لعل نامہ'' کے کچھ واقعات یک زمان ہیں۔ ''آفتاب شجاعت''، سوم، ص ۴۹۱ پر داستان گو مزید بتاتا ہے کہ اصل قصہ تو ''لعل نامہ'' میں ختم ہو جاتا ہے، لیکن مجھے یہ دفتر (''آفتاب شجاعت'') بالکل اتفاق سے دستیاب ہو گیا۔ اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ روایتی طور پر تو اختتام قصہ ''لعل نامہ'' ہی پر ہو جاتا ہے (یعنی یہ داستان اس سلسلے کی آخری کڑی ہے)، لیکن ''آفتاب شجاعت'' میں جو باتیں مذکور ہیں وہ ''لعل نامہ''

کے کچھ پہلے کی، یا کم وبیش ''لعل نامہ'' ہی کے زمانے کی ہیں۔ مطبع کی فہرست برائے ۱۹۱۱ میں درج ہے کہ'' گلستان باختر کی تیسری جلد میں کل داستانوں کا اختتام ہے۔'' اس بات سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ'' گلستان باختر'' اور''لعل نامہ'' کے بعض واقعات میں یک زمانی ہے۔

''لعل نامہ'' کی اشاعت '' آفتاب شجاعت'' کے بہت پہلے ہوئی تھی، اور'' گلستان باختر'' تو تاریخ اشاعت کے لحاظ سے سب سے موخر ہے۔ لہٰذا ''لعل'' کے مافیہ کو ہم پہلے ہی جان چکے ہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ ''لعل'' کے واقعات میں داستان کا حتمی انجام نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ برحق معلوم ہوتا ہے کہ داستان گو نے'' آفتاب شجاعت'' اور'' گلستان باختر'' کے بارے میں یہ تصور کیا ہے کہ ان کے کچھ واقعات اسی زمانے میں پیش آئے جب ''لعل نامہ'' کے واقعات رُوپذیر ہوئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حافظے کی کچھ کرشمہ کاری بھی یہاں رہی ہو اور داستان گو کو تمام واقعات کی ترتیب یاد نہ رہی ہو۔ بہر حال، ''لعل نامہ'' کا بڑا حصہ ایسے واقعات کی روداد پر مشتمل ہے جن کے وقوع پذیر ہونے کے بعد داستان خود بخود ختم ہونے لگتی ہے۔ اب اگر کوئی داستان گو ایسی داستانیں بھی لکھتا جن میں تیمور (یعنی صاحب قران پنجم ) کی صاحب قرانی بیان کی جاتی، تو بھی اس داستان کو ہم ''لعل نامہ'' کے پہلے ہی رکھتے۔

داستان کے اختتام، یا Denouement کا سلسلہ لندھور بن سعدان خسرو ہندوستان اور اس کے محبوب ہاتھی فیل میمونہ مبارک کی اموات سے شروع ہوتا ہے۔ زمرد شاہ ثانی سے جنگ کے دوران پہلے تو فیل میمونہ مبارک زخم کھا کر مرتا ہے، پھر زمرد شاہ ثانی کے آدم خور فوجیوں کا پنجہ لندھور پر قابض ہو جاتا ہے اور وہ اسے زندہ کھاڈالتے ہیں۔ اس کے بعد بدیع الزماں گھوڑے سے گر کر موت کے گھاٹ اترتا ہے۔ حمزۂ ثانی کو ہم گذشتہ داستان میں ایک سو چالیس ساتھیوں کے ساتھ عازم کعبہ دیکھ چکے ہیں۔ اثنائے راہ میں ان کا ہر ساتھی اپنی موت کا خواب دیکھتا ہے۔ ابھی وہ خانہ کعبہ سے دور ہیں کہ ایک مقام پر فوج ساحراں انھیں گھیر کر ان کے اردو میں آگ لگادیتی ہے۔ صرف بہتر نفر بچتے ہیں۔ ان کو لے کر اب وہ کعبہ پہنچتے ہیں اور'' شاہ احد'' سے مصروف جنگ ہوتے ہیں۔ '' شاہ احد'' کو حمزۂ ثانی قتل کر دیتے ہیں، لیکن خود حمزۂ ثانی، اور ان کے ساتھ حمزۂ اول بھی جام شہادت نوش کرتے ہیں۔

ان حادثات کے بدحواس ہو کر عمرو عیار اپنی موت کی تمنا کرتا ہے۔ ''نوشیرواں نامہ'' میں مذکور ہے کہ اسے تب ہی مرنا ہے جب وہ تین بار خود اپنی موت کی دعا کرے۔ عمرو در بدری کے عالم میں دوسری بار، اور پھر تیسری بار موت کی تمنا کرتا ہے۔ وہ شہر شہر مارا مارا پھرتا ہے، لیکن ہر جگہ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ کسی کی قبر کھود رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کی قبر کھودی جاری ہے! آخر کار وہ ایک شہر میں پہنچتا ہے جہاں ایک تازہ کھودی ہوئی قبر میں اسے ایک قیمتی لعل پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لالچی عمرو اپنے خوف کو بھلا کر لعل کی خاطر قبر میں کود پڑتا ہے اور قبر آپ سے آپ بند ہو جاتی ہے۔ شہنشاہ عیاراں اور دنیا کے سب سے بڑے شاطر اور چور کا انجام اس سے زیادہ مناسب اور بہتر بھلا کیا ممکن تھا۔

حمزہ اور عمرو چونکہ ایک دوسرے کے ہمزاد کا حکم رکھتے ہیں، اور ساری داستان میں یہی دونوں جاری وساری ہیں، لہٰذا ان کے بعد داستان کے جاری رہنے کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ایسی جلدیں اس داستان میں بہت ہیں جن میں حمزۂ اول کے بعد کے صاحب قرانوں کا ذکر ہے، اور ایسی بھی داستانیں ہیں جن میں امیر حمزہ کی کسی اولاد کی مہمات کا ذکر زیادہ ہے، لیکن ایسی کوئی جلد نہیں جس میں ''لعل نامہ'' کے واقعات، یا اس کی طرح کے واقعات بیان ہوئے ہوں۔ امیر حمزہ اور عمرو عیار جب اٹھ گئے تو داستان بھی سو گئی ☆☆

باب سوم

# داستان امیر حمزہ، کتنے صفحے؟

داستان (طویل) کی جلدوں پر بحث کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سوال کا جواب، کہ کل داستان میں کتنے صفحے ہیں؟ پوری طرح طے نہیں ہو سکا ہے۔ کوئی پینتالیس ہزار کہتا ہے (راز یزدانی)، کوئی پچاس ہزار (عابد رضا بیدار) تو کوئی بیالیس ہزار (شمس الرحمن فاروقی)۔ خیر یہاں بہت زیادہ فرق نہیں۔ بعضوں کے اندازے اور بھی غیر قطعی ہیں (''ہزار ہا صفحات''، ''بے شمار صفحات''، وغیرہ)۔ لیکن یہاں دو سوال اٹھتے ہیں: داستان کی طوالت کو دیکھتے ہوئے اس کے شائقین یا عام پڑھنے والوں کو یہ کرید ضرور لگتی ہوگی کہ بھلا یہ داستان ہے کتنی لمبی چوڑی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی؟ یا پھر اس کا حجم تو اردو فارسی کی کسی بھی معلوم کتاب سے بھی بڑھا ہوا ہے، تو پھر اس بحر بظاہر ناپیدا کنار کا دوسرا ساحل کہاں ہے؟ صاحبان مطبع بھی داستان کی طوالت کا بہت ذکر کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ برابر اس قسم کی عبارت لکھتے ہیں جس میں داستان کی بے اندازہ طوالت کا اشارہ ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۸۹۳ کی اشاعت ''نوشیرواں نامہ، اول'' کے سرورق پر انھوں نے جو عبارت لکھی تھی اسے میں یہاں موجودہ کتاب کے باب اول میں درج کر چکا ہوں، وھوہٰذا:

> واضح ہو کہ داستان امیر حمزۂ صاحب قران وہ بحر ذخار ہے جس کے منتہاے قعر تک زنجیر فکر کا پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ جن صاحبوں نے یہ داستان ملاحظہ فرمائی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر داستان کا کس قدر حجم بزرگ ہے۔

صاحبان مطبع نے خود کبھی بیان نہیں کیا کہ سب جلدوں کے صفحات کو جمع کیا جائے تو کتنے صفحے

بنیں گے۔ اس کی وجہ سہل انگاری بھی ہو سکتی تھی، اور تجارتی مصلحت بھی، کہ کتاب کے صفحات ظاہر کرنے سے اس کی عدیم النظیر طوالت اور بے اندازہ وسعت کا احساس کم ہو جائے گا۔ اس کی ایک علت یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں طویل کتابیں عام کی حیثیت رکھتی تھیں، مستثنیٰ کی نہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر کتاب بہت طویل و عریض ہوتی، لیکن ننھی منی پتلی کتابوں (جنھیں عام طور پر رسالہ کہتے تھے) کی تعداد ضخیم و جسیم کتابوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے پتلے پتلے رسالے ایک ہی مجلد میں بندھوا لئے جاتے تھے۔ یہ رواج بہت دن تک رہا۔ اکثر تو مصنف ہی اپنی متعدد لیکن مختلف چھوٹی چھوٹی کتابوں کو یکجا بندھوا کر بازار میں لاتا تھا۔ اکثر شائقین کتاب بھی متعدد پتلی کتابوں کو ایک ہی جگہ مجلد کر لیتے تھے۔ میرے گھرانے میں پرانے کتب خانوں یا مجموعہ ہائے کتب میں یہ صورت عام ہے۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی بظاہر کم اہم کتاب کے ساتھ کوئی بہت اہم کتاب جلد بند ہو گئی ہے اور اس خاندان کو، جس کے کتب خانے میں وہ اہم یا نادر کتاب ہے، اسے اس کی خبر ہی نہیں۔

نیا زمانہ آتے آتے کتابوں کی ضخامت چھوٹی ہونے لگی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کتاب کو گھر میں بیٹھ کر، بلکہ آرام سے بستر میں لیٹ کر پڑھنے کا رواج پیدا ہوا۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گھروں میں روشنی کے سامان نسبۃً محفوظ اور وافر ہونے لگے۔ جیسا کہ ہم رتن ناتھ سرشار کی تقریظ بر "طلسم ہوش ربا"، جلد پنجم، میں دیکھ چکے ہیں (جلد اول، صفحہ ۳۸۲)، اب کتاب کو آرام اور فرصت سے پڑھنے کی چیز بنا دینے کا رجحان ایک نئی لیکن عام سماجی حقیقت بنتا جا رہا تھا۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سفر کے وسائل آسان تر ہوئے۔ ریل کا سفر عام ہوتے جانے کے باعث کتاب، یا کسی بھی سامان کے بھیگ کر ضائع ہونے کا امکان کم ہو گیا۔ اب وہ بات نہ تھی جیسی مصحفی کے مطلع میں نظر آتی ہے۔

یوں رو رو اس گلی میں دن رات کاٹتے ہیں
رستے میں جوں مسافر برسات کاٹتے ہیں

مرفہ الحال سواریاں (اور زیادہ تر یہی لوگ ریل کا سفر کرتے تھے، اور یہی لوگ اکثر کتاب پڑھنے والے ہوتے تھے) پورا پورا ڈبہ اپنے اور اپنے ساتھی مسافروں کے لئے محفوظ کرا لیتے۔ اکبر الہ آبادی کو ایک بار دہلی سے الہ آباد واپس آنے کی جلدی تھی تو انھوں نے پورا ڈبہ اپنے لئے محفوظ کرا لیا کہ عام ٹرین میں جگہ نہ

تھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ صرفہ تو بہت ہو گیا لیکن آرام سے، اور بہت کم وقت میں الٰہ آباد آ گیا۔ دہلی سے چھٹکارا ملا، وہاں تو قمری کی بھی آواز بھی سنائی نہ پڑتی تھی۔

یہ تو اکبر الٰہ آبادی جیسے متوسط الحال سفید پوش کا حال تھا۔ مسافروں میں جو واقعی بڑے لوگ ہوتے، وہ پورا پورا ڈبہ کیا، پوری پوری ریل گاڑی اپنے لئے محفوظ کرا لیتے تھے۔ جو چاہتے اور جتنا چاہتے، سامان سفر ساتھ رکھتے۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں محمد حسین آزاد نے ریل کی سواری کو کہا تھا کہ بس ایک تخت رواں ہے کہ اڑا چلا جاتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ تا ۱۹۰۳) نے ''فسانۂ آزاد'' میں، چودھری محمد علی ردولوی (۱۸۸۶ تا ۱۹۵۳) اور جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ تا ۱۹۸۲) نے اپنے اپنے سوانح میں ریل کی آسائشوں کا جو حال لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے گھر کے باہر سفر اور گھر کی دنیا میں کچھ بہت نفسیاتی یا طبیعیاتی تفاوت نہ تھا۔ اب سفر میں کتاب یا کسی بھی قیمتی یا نازک شے کا بحفاظت ساتھ رکھنا اور برتنا ممکن ہو گیا تھا۔

ریل کے سفر کی محفوظ آسائش مطالعۂ کتاب کے لئے مناسب تھی، لیکن اسی وقت جب کوئی سفر میں ہو۔ لیکن اب ایسے رسالے بھی تھے جن میں ناول بالاقساط چھپتے تھے۔ لہٰذا پورے ناول یا کسی شاعر کے پورے کلیات، یا کسی طویل مثنوی کو تمام و کمال ساتھ ساتھ لئے پھرنے کا روگ نہ تھا۔ ایک دو قسطیں یا ایک دو اجزا اٹھائے اور سفر پر چل دیئے۔ پھر، یہ بھی نہ تھا کہ سفر پر نکلے تو برسوں یا کم از کم مہینوں کی خبر لائیں گے۔ ریل بننے کے پہلے دہلی سے لکھنؤ کا سفر کم سے کم ایک مہینے میں طے ہوتا تھا۔ ریل نے یہ فاصلہ چوبیس گھنٹے سے بھی کچھ کم کر دیا۔ ریل بننے کے کچھ برس پہلے غالب نے دہلی سے رامپور کا سفر، جس کی مسافت بمشکل سو میل تھی، پانچ سے سات دن میں تمام کیا تھا۔ ریل گاڑی کے لئے یہ فاصلہ سات آٹھ گھنٹے سے زیادہ کا نہ تھا۔

پریس کا رواج بڑھا تو شروع شروع میں کچھ کتابیں بہت بڑی تقطیع پر بھی چھپی تھیں، شاید یہ دکھانے کے لئے کہ جو کام خطاط گھر پر کر سکتا ہے وہ ہم پریس میں بیٹھے بھی کر سکتے ہیں اور سب کے لئے کر سکتے ہیں، جب کہ خوش نویس تو ایک وقت میں محض ایک مربی کی خدمت کر سکتا ہے۔ اس زمانے میں بہت بڑی تقطیع کی کتاب کی لمبائی عموماً سولہ انچ اور چوڑائی دس انچ ہوتی تھی۔ حوض کی لمبائی ساڑھے تیرہ انچ

اور چوڑائی ساڑھے سات انچ رکھی جاتی تھی۔ طباعت میں خطاط کی تحریر سے مشابہت قائم رکھنے کا اتنا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ بہت سی کتابوں کو بیک نظر دیکھیں تو دھوکا ہوتا تھا کہ یہ پتھر سے منطبع نہیں ہوئی ہیں بلکہ ہاتھ ہی سے لکھی گئی ہیں۔ مطبوعہ کتاب کی اجنبیت اور کم ارزی کو گھٹانے کی بھی یہ کوششیں اسی لئے ہوتی تھیں کہ مخطوطہ سے مطبوعہ کی طرف ذہن اور ذوق بآسانی منتقل ہو سکیں، یعنی مطبوعہ کتاب اجنبی نہ محسوس ہو۔

ظاہر ہے کہ لیٹ کر پڑھنے یا سفر میں ساتھ لے جانے کے لئے بہت بڑی تقطیع کی کتاب موزوں نہ تھی۔ آہستہ آہستہ طباعت کے سلسلے میں اعلیٰ معیار کا تصور یہ قائم کیا جانے لگا کہ حروف اتنے ہی روشن اور پڑھنے میں اتنے ہی آسان ہوں، جتنے مخطوطہ کتاب میں ہوتے ہیں، بلکہ اور بھی زیادہ روشن ہوں تو خوب، چاہے ان میں مطلا اور مذہب ہونے کا اہتمام نہ ہو۔ کتابت کا التباس پیدا کرنا ضروری نہ رکھا گیا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ مخطوطات میں تو اوراق مصور کا خاص اہتمام اور انتظام ہوتا تھا۔ لیکن ورق جتنا ہی مطلا اور رنگین ہوگا اتنا ہی قیمتی، دیر میں تیار ہونے والا، اور جلد ضائع ہونے کے جوکھم میں گرفتار رہنے کا امکان رکھتا تھا۔ لہٰذا اب کتابوں میں تصویریں "چھپنے" لگیں، یعنی خود کاتب یا مصور سیاہ روشنائی سے تصویر کا صرف بیرنگ (خاکہ) بنا دیتا، اور وہ خاکہ اصل متن کے ساتھ مناسب صفحے یا جگہ پر ہزاروں کے حساب سے چھپ جاتا۔ نول کشور تو نہیں، لیکن دہلی کے بعض مطبعوں نے یہ رسم بھی نکالی کہ ایسی سادہ لکیروں والی تصویروں میں سے چند میں وہ مصور سے رنگ بھی بھروا دیا کرتے تھے، کہ کچھ تو حق ادا ہو جائے۔ میرے پاس انیسویں صدی کی غالباً چوتھی دہائی میں دہلی کی مطبوعہ داستان (مختصر) از خلیل علی اشک کا ایک نسخہ ہے جس میں ہاتھ سے رنگی ہوئی خاکہ تصویروں کا اہتمام ہے۔

کثیر تعداد میں چھپنے اور دور دور تک بآسانی لے جائے جانے کی رسم کے باعث کتاب کے عام حجم میں بھی فرق آیا۔ اب "کلاں تقطیع" سے زیادہ تر مراد ہوتی تھی ایسی کتاب جس کی لمبائی گیارہ انچ اور چوڑائی ساڑھے چھ انچ، اور حوض ساڑھے نو انچ اور ساڑھے پانچ انچ کا ہو۔ متوسط تقطیع سے مراد تھی ایسی کتاب جس کی لمبائی دس انچ اور چوڑائی چھ انچ ہو، لیکن حوض آٹھ انچ اور پونے پانچ، یا حد سے حد پانچ انچ کا ہو۔ زیادہ تر کتابیں انھیں کلاں یا متوسط تقطیعوں پر چھپتی تھیں۔ ان باتوں کی بنا پر جدید علمی کتابیں تو چھوٹی ہوئیں ہی، تفریحی کتابیں بھی ہلکی پھلکی ہونے لگیں۔ لیکن یکسانی ابھی بہت کم تھی۔ یعنی

ایک ہی تقطیع کی دو کتابوں میں فی صفحہ سطروں کی تعداد، اور فی سطر الفاظ کی تعداد برابر ہونا ضروری نہ تھا۔ یہ بھی ضروری نہ تھا کہ کسی کتاب کی کئی جلدیں ہوں تو ہر جلد لامحالہ ایک ہی تقطیع میں ہو اور ہر تقطیع میں سطروں اور الفاظ کی تعداد کے یکساں رکھنے کا لحاظ رکھا جائے۔

تیسری اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ کتابیں بسبیل ڈاک خانہ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجوائی جانے لگیں۔ پھر چند دہائیوں کے بعد منی آرڈر اور وی۔ پی۔ کی آسانیوں، اور بک پوسٹ یعنی (Printed Paper, Reduced Rate) کی سہولتوں نے مطبع / پبلشر / کتب فروش کے لئے کتابوں کی ترسیل بہت آسان کردی۔ اور ظاہر ہے کہ ڈاک کے ذریعہ بھیجنے کے لئے وہی کتابیں موزوں تھیں جن کا حجم زیادہ نہ ہو اور جنھیں پیکیٹ کی شکل میں روانہ کرنا آسان ہو۔

لہٰذا چھوٹی اور کم ضخامت کی کتاب کے فروغ میں ریل کے سفر کی آسائشوں کا مہیا ہونا، مطالعے کے طرز و طور میں تبدیلی، اور ڈاک خانے کی سہولت کا بڑا ہاتھ ہے۔ چھوٹی کتاب کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ بڑی کتاب کی موافقت میں آہستہ آہستہ ایک معکوس نخوت (Reverse snobbery) بھی وجود میں آنے لگی، کہ اوروں کی کتابیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی، لیکن ہماری کتاب تو پہلے ہی جیسے جہازی رنگ روپ کی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی "موازنۂ انیس و دبیر" (اول طباعت ۱۹۰۷) کا جہازی حجم (سولہ انچ × دس انچ) غالباً اس بات کا اشارہ تھا کہ ہماری کتاب کے مطالب نئے ہوں تو کیا، ہم ہیں اسی پرانے وضع دار اور محترم مکتب کے جہاں سے (مثلاً) مولوی بحر العلوم کی "شرح مثنوی مولانا روم" (نولکشوری، ۱۸۷۷) نکلی ہے۔ مولوی بحر العلوم کی اس سہ جلدی شرح کی لمبائی سوا بارہ انچ اور چوڑائی سوا نو انچ تھی۔ اس کا حوض ساڑھے دس انچ اور سوا سات انچ تھا۔ "بوستان خیال" کے دونوں اردو تراجم (دہلوی، پھر لکھنوی) کی اشاعتیں بھی اسی جہازی تقطیع پر شائع ہوئی تھیں۔

لیکن داستان امیر حمزہ جیسی مقبول کتاب کے لئے تو یہی مناسب تھا کہ وہ یسیر الحمل ہو، اور ساتھ ہی ساتھ اس کے صفحات کثیر ہوں۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ صفحات کی کثرت کا تصور بھی زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا ہے۔ محمد حسین جاہ کی "طلسم فصاحت" جو غالباً پہلی داستان ہے جو نول کشور پریس سے چھپی (اول اشاعت ۱۸۷۴)، اس میں بمشکل تین سو صفحات ہیں۔ یہ

داستان کئی بار چھپی اور اغلب ہے کہ اس داستان، اور داستان امیر حمزہ یک جلدی، کی مقبولیت نے نول کشور کو داستان امیر حمزہ کے طویل چرخ کی اشاعت کے لئے مہمیز کیا ہو۔

زمانے کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں رونما ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بڑی کتاب کا چلن کم ہو جاتا ہے، لیکن متوسط تقطیع (جسے اس زمانے میں ''کلاں تقطیع'' کہتے تھے)، مقبول ہونے لگتی ہے۔ اس تقطیع میں خوبی یہ تھی کہ کتاب کو ہاتھ میں لے کر لیٹ کر یا آرام کرسی میں نیم دراز ہو کر پڑھنا آسان تھا۔ دوسری بات یہ کہ داستان کی تو فطرت ہی طوالت تھی، اس لئے اکا دکا کو چھوڑ کر داستانیں کئی کئی جلدوں پر پھیلنے لگ گئیں (یا پھیلائی جانے لگیں) اور اس طرح زبانی روایت کی لائی ہوئی طوالت کا حق بھی بڑی حد تک پورا ہونے لگا۔

دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ وقت کی تنگی اور کثیر پیداواری (Mass Production) کے تقاضوں نے مطبوعہ کتابوں میں مصور اوراق اور مطلا و مذہب عناصر کم کر دیئے۔ پرانے زمانے کی خوبصورت، مصورانہ فن کاری اور نقشہ نویسی کی ہنر مندی والی تصویروں کے بجائے خاکے والی تصویروں کا چلن بڑھا۔ دام بھی کم رکھنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا کاتب، بلکہ کبھی کبھی تو خود مشین مین، تصویروں کی جگہ کم سے کم خاکہ نگاری (Reductionist drawing) کی مثال بنا کر پیش کر دیتا تھا، کہ بس ان چند لکیروں اور چند خطوط جسم کے ذریعہ ہی تحرک اور زندگی یا وقوعے کا احساس پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، بعض کتابوں میں خاص خاص تصاویر کو کاتب یا کوئی مصور اپنے ہاتھوں سے واٹر کلر یا پیسٹل اور پنسل سے رنگ کر ''رنگین تصویر'' کا التباس پیدا کرتا تھا۔ ان باتوں کے باعث کتابوں کو مصور کرنے کا ایک نیا اسلوب آہستہ آہستہ وجود میں آیا۔

تصویر کشی کے پرانے اسلوب میں تناظر (Perspective) کا کوئی تصور نہ تھا، اور نہ اس بات کی اہمیت تھی کہ صاحب شبیہ کو اپنے ماحول میں ممتاز دکھانے کے لئے سامنے کے طریقے استعمال کئے جائیں (مثلاً اس کے پس منظر میں کوئی محل سرا قسم کی عمارت ہو، یا وسیع صحرا نما جنگل ہو، یا کمرے میں وہ اس طرح بیٹھا ہوا ہو کہ سارا کمرہ اس کی شخصیت تلے دبا جا رہا ہو۔ یہ انداز مغربی مصوری، اور خاص کر اس انگریزی مصوری کے تھے جو اٹھارویں صدی سے ہمارے یہاں عام ہوئی)۔ لہٰذا اگر کسی کی شخصی شبیہ بھی

ہے تو ہماری کتابوں میں اسے اس طرح نہ بناتے تھے کہ صاحب تصویر اپنے ماحول پر حاوی نظر آئے، بلکہ بسا اوقات تو امیر حمزہ کی بھی شخصیت اپنے مدمقابل کے سامنے منحنی اور مشینی اور بے جان نظر آتی تھی۔

نئے زمانے کی مطبوعہ کتابوں میں نئے طور کی تصویر کشی ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ اب تصویر کشی میں مغربی (یعنی ہندوستانی + مغربی) اصول کا بھی لحاظ رکھا جانے لگا۔ اب بعض داستانوں، خاص کر ''بوستان خیال'' میں تصویریں ایسی بنتیں کہ مرکزی کردار کی مرکزیت نمایاں لگتی اور وہ داستان کا واقعی اہم کردار معلوم ہوتا۔ اسی قیاس پر ''بوستان خیال'' کی ایک جلد ''بدر الاثار'' مترجمہ خواجہ امان (مطبوعہ مطبع بدر الدجیٰ، دہلی، ۱۸۷۴) میں مہاراجہ پٹیالہ کی ایک شبیہ ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ (جلد کے مترجم) خواجہ امان انھیں کتاب پیش کررہے ہیں۔ معمولی لیتھو پر لوہے کے قلم سے بنی ہوئی اس تصویر میں اس قدر قوت اور زندگی ہے کہ باید و شاید۔ مہاراجہ کی تصویر تو اس قدر نمایاں ہے کہ بالکل ایسا لگتا ہے کہ فریم کو توڑ کر باہر آجائے گی۔ فوٹو گرافی کے انداز کا ایسا مبالغہ آمیز لیکن موثر استعمال انیسویں صدی کی ہندوستانی مطبوعات کے سوا کہیں اور شاید ہی دیکھنے کو ملے گا۔

جس طرح رسل و رسائل اور سفر کے طور طریق میں تبدیلی کے باعث کتاب کی نوعیت بدلی، اسی طرح کتاب کی بدلتی ہوئی شکل نے اپنی طرح کے اثرات پیدا کیے۔ ایک تو یہ کہ اب کتاب سازی، یعنی کتاب کا بنانا، اسے محفوظ رکھنا، فروخت کرنا، وغیرہ، فن اور صناعت یا ہنر کے منطقے سے نکل کر حرفت (Industry) بن گیا۔ کتابوں کو نمائشی انداز میں رکھنے، یعنی display کرنے کا بھی رجحان بڑھا۔ اب کتابیں اوپر تلے نہیں، بلکہ کھڑی رکھی جانے لگیں، اس طرح کہ ان کے پشتے پر کچھ لکھا ہو تو نمایاں ہو جائے، اور ان کی ضخامت بھی صاف دکھائی دے۔ ہمارے ملک میں پرانی کتابوں کی اکا دکا نیں جو رہ گئی ہیں وہاں کتابیں اب بھی زیادہ تر الماری یا شیلف میں نمایاں نہیں کی جاتیں، بستوں میں بندھی رکھی رہتی ہیں۔

آغاز طباعت کی صدی (یعنی سولہویں صدی) میں یہ صورت حال مغرب میں بھی نظر آتی ہے کہ کثیر پیداواری کے باعث اب کتابوں میں حسن، تقطیع، یا حجم کی یکسانی ضروری نہ رہ گئی۔ لیکن وہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ طباعت کا چلن نئے زمانے یعنی (Modern Age) کے بہت پہلے آگیا تھا اور اس

وقت کتاب سازی کے پرانے فنی اقدار باقی تھے۔ جلد سازی کا پیشہ بھی بہت ترقی پر تھا اور مشہور جلد سازوں کی بنائی ہوئی کتابوں کی تقریباً دہی آؤ بھگت ہوتی تھی جو کسی مشہور خطاط یا پریس کی تیار کی ہوئی کتاب کی تھی۔ پھر کئی صدیوں کی مشق نے انیسویں صدی تک آتے آتے کتابوں کے حجم، ان کی جلد بندی، ان کے ٹائپ چہرہ (type face) ، کے رسومیات سب طے کردیے تھے۔ مثلاً میرے پاس سترہویں صدی کی چھپی ہوئی جو انگریزی کتابیں ہیں (ان میں سے قدیم ترین ۱۶۸۰ کی مطبوعہ ہے)، ان سب کا حجم کم لیکن حرف بڑے بڑے ہیں۔ یعنی فی سطر الفاظ کا اوسط بہت کم ہے، حوض بھی نسبۃً چھوٹا ہے۔ اس طرح کتاب کا اصل حجم (یعنی کتاب میں الفاظ کی تعداد) کتاب کی ضخامت کے مقابلے میں کم ہے۔ اٹھارویں صدی کی مطبوعہ کتابوں میں دونوں طرح کی صورت ہے، کہ بعض کا حجم بڑا اور حروف بڑے ہیں تو بعض کا حجم کم اور حروف بہت چھوٹے ہیں، اور بعض ایسی بھی ہیں کہ ان کا حجم بڑا لیکن حروف متوسط اور روشن ہیں۔ یعنی اب اٹھارویں صدی میں ایسی کتابیں بھی بننے لگیں جنھیں ہاتھ میں لینا، لیٹ کر پڑھنا، نسبۃً کم روشنی میں پڑھ لینا، یا کہیں ساتھ لے جانا، سب آسان ہو اور جن کے حجم اور ضخامت میں تناسب بھی بہتر ہو۔

اس طرح کئی سو برس کے طریق عمل (Practice) کے نتیجے میں مغربی ممالک نے اپنے یہاں کتاب سازی، کتاب کی تکثیر اشاعت (mass production) ، اور فروخت کے لئے رسوم اور ضابطے (protocol) تیار کیے۔ حتیٰ کہ کاغذ کے اقسام کے بارے میں بھی اتفاق رائے ہو گیا کہ اخبار کس طرح کے کاغذ پر چھپے گا، مقبول، عوامی ناول کس طرح کے کاغذ پر، شاعری کس طرح کے کاغذ پر، علمی کتابیں کس طرح کے کاغذ پر (اور اکثر کس تقطیع پر) چھپیں گی، وغیرہ۔ شروع شروع میں مخطوطوں کی تقلید میں صفحات پر نمبر ڈالنے، بلکہ فہرست مشمولات، اور اوقاف اور پیرا گراف لگانے کا بھی رواج نہ تھا۔ کتابوں کو ابواب میں بھی بمشکل ہی تقسیم کرتے تھے۔ یہ سب باتیں آہستہ آہستہ وجود میں آئیں اور بہت جلد ہر کتاب کے لئے ضروری قرار دی گئیں۔

اوقاف لگانے کی رسم کا چلن اٹھارویں صدی کے اواسط سے مغرب میں اتنا بڑھا کہ طابع (اور شاید ناشر بھی) اتنے تحکمانہ ہو گئے کہ مصنف کی مرضی کے علی الرغم بھی اوقاف لگا دیتے تھے۔ لہٰذا

اوائل انیسویں صدی تک کی بہت سی انگریزی (بالخصوص شاعری) کی کتابوں کے بارے میں دعویٰ کرنا غیر ممکن ہے کہ اس میں سارے اعراب واوقاف خود شاعر کے متعین کردہ ہیں۔ اور آج بھی بڑے ناشر اوقاف اور املا کے بارے میں اپنی پالیسی رکھتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ مصنف اس کی پوری پابندی کرے گا۔ اس کے علاوہ بڑے ناشروں کے یہاں ''مدیر'' (Editor) بھی ہوتا ہے جو اوقاف، بلکہ صرف و نحو اور لفظیات کے بھی بارے میں مصنف کو مشورہ دیتا ہے۔

یہ سب باتیں نئے زمانے کی ہیں۔ پروف کی درستی اور مشمولات کی صحت کا جو معیار ہم آج (بلکہ آج تو نہیں، کوئی پچاس برس پہلے تک کی مطبوعہ) مغربی کتابوں میں دیکھتے ہیں، وہ شروع شروع میں وہاں مفقود تھا۔ ناشر/ تابع نے بہت مہربانی کی تو شروع یا آخر کتاب میں غلط نامہ لگا دیا، ورنہ کتاب جانے، اس کی غلطیاں، اور اس کے پڑھنے والے۔ شروع شروع میں ہمارے یہاں بھی یہی تھا کہ کتابت کی صحت کا ذمہ دراصل کتاب کے مصنف یا اس کے لکھوانے والے کا ہوتا تھا۔ مشتری یا مصنف کاتب کے تمام اوراق کی دوران کتابت نگرانی کرتا اور اس بات کا لحاظ رکھتا تھا کہ اغلاط نہ ہوں، اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اسے مٹا دیا جائے یا اس کی تصحیح کر دی جائے۔ مطبوعہ کتابوں میں یہ امکان کم ہو گیا، بلکہ پھر معدوم ہی ہو گیا۔ یعنی مصنف کی ذمہ داری کم از کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔ اب تو مصنف کا کام مسودہ تیار کر کے پریس کے حوالے کر دینا تھا اور بس۔ اس لئے اغلاط کی درستی کی طرف توجہ بھی کم ہو گئی۔

نول کشور پریس کی مطبوعات میں غلطیاں بے شمار ہوتی ہیں، خاص کر فارسی عربی کی مشکل کتابوں میں۔ داستان (طویل) میں بھی اغلاط کچھ کم نہیں، کیونکہ داستان میں نامانوس الفاظ بکثرت ہیں۔ ہم لوگ ان اغلاط کو ''ہندوستانی'' نااہلی پر محمول کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار طالب علمی کے زمانے میں آکسفورڈ (Oxford) یا میک میلن (Macmillan) کی چھاپی ہوئی ایک کتاب میں ایک سہو طباعت میں نے اسکول میں ماسٹر صاحب کو دکھایا تو انھوں نے مان کے نہ دیا، یہی کہتے رہے کہ پبلشر کا نام جھوٹ سے لکھ دیا گیا ہے، انگلینڈ کی مطبوعہ کتاب میں طباعت کی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ صنعت وحرفت کے طور پر کتاب بنانا اور گنے چنے، باذوق اور باحوصلہ واستطاعت شائقین کے لئے کتاب بنانا وہی فرق رکھتا ہے جو کئی برس یا مہینے کی محنت، سوچ، تخلیقی سرگرمی

اور ذہنی تجسس صرف کرنے کے بعد کوئی مجسمہ تراشنے میں اور ساحل بحر پر بیٹھے بیٹھے ہر چند منٹ میں ایک ریت کا کھلونا بنا ڈالنے میں ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی خیال میں رکھئے کہ ہم جب انیسویں صدی کی چھپی ہوئی کوئی اچھی انگریزی کتاب دیکھتے ہیں (میں اچھی کتاب کی بات کر رہا ہوں، ناول وغیرہ ابھی وہاں بھی بہت اہتمام کے مستحق نہ تھے) تو اس کے پیچھے کوئی چار سو برس کی روایت دیکھ رہے ہیں۔ اور ہماری کتاب جو انیسویں صدی کی مطبوعہ آپ کے سامنے ہے وہ اس روایت کا پہلا، یا حد سے حد دوسرا قدم ہے۔ ہم اپنی طویل داستانوں میں پیراگراف اور اوقاف نہ دیکھ کر متوحش اور منغض ہوتے ہیں (اگر چہ داستان کی حد تک اس کمی کے فائدے بھی ہیں، جیسا کہ ہم جلد اول میں دیکھ چکے ہیں)۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انیسویں صدی کی یہ کتابیں ہمارے فن طباعت کی تاریخ میں بچوں اور لڑکوں کا درجہ رکھتی ہیں، ابھی اس فن نے ارتقا کے وہ منازل طے نہیں کئے ہیں کہ اس کے بالغ اور باشعور نمونے سامنے آئیں۔ اور یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر کی مطبوعہ کتابوں چھپائی کی صفائی، اور بعض کتابوں میں خطاطی، (بالخصوص سرنامے اور سرورق کی خطاطی) پرانی کتابوں کو بے شک مات کرتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی کتاب سازی میں جہاں نقائص ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں۔

انیسویں صدی میں جب ہمارے یہاں پریس کا دور دورہ بڑھنے لگا تو کتاب سازوں کے سامنے ایک معاملہ یہ بھی تھا کہ لوہے کے حرف یا پتھر پر جمائے ہوئے حرف میں وہ خوبصورتی، یعنی نوک پلک کی وہ باریکی، نہ آسکتی تھی جو مخطوطہ کتابت میں ممکن تھی۔ لہٰذا (جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوا) بعض ہوشیار طابعوں نے طرز کتابت اور پتھر کی داب کا خاص اہتمام اس طرح کا کرنا شروع کیا کہ ایک نظر میں، بلکہ بغور دیکھنے پر بھی شک رہتا ہے کہ کتاب مطبوعہ ہے بلکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میرے پاس شیفتہ کی ''گلشن بے خار'' (مطبوعہ دہلی اخبار پریس، ۱۸۴۳) کا ایک نسخہ ہے۔ آج بھی اسے جب کھولتا ہوں تو گمان گذرتا ہے کہ مخطوطہ دیکھ رہا ہوں۔ یہی عالم مطبع سلطانی دہلی سے ۱۸۱۴ میں چھپی ہوئی بہادر شاہ ظفر کی 'شرح گلستاں'' کا ہے۔ اگر کتابوں کی مانگ بہت نہ بڑھتی، یا تقاضا کرنے والے بہت مبرم نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ طباعت کا ایسا انداز ہمارے یہاں فروغ پا جاتا جس میں مطبوعہ اور کتاب کا بھی معیار حسن مخطوطے جیسا ہوتا۔ لیکن تکثیر اشاعت کی حرکیات میں تاخیر کی گنجائش نہیں اور جب تاخیر کی جگہ تعجیل ہو تو

سب سے پہلی شے جو متاثر ہوتی ہے وہ معیار کتابت وطباعت ہے۔

جن پریسوں میں لوہے کا ٹائپ استعمال کیا گیا (اردو فارسی کی حد تک اوائلی زمانے کے بنگال میں ایسا تقریباً ہمیشہ تھا)، وہاں اغلاط کے علاوہ دو اور طرح کے بھی مسائل تھے۔ اغلاط کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی کبھی ذرا سی لاپروائی سے ٹائپ اوپر نیچے لگ گیا تو عبارت مخدوش، یا مغشوش ہو سکتی تھی۔ میرے پاس ''دریائے لطافت'' کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ مطبع آفتاب عالم تاب (۱۸۵۰) کا ایک نسخہ ہے۔ یہ مکمل متن ابھی کہیں نہیں چھپا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں دو صفحوں پر ٹائپ کے ادھر ادھر لگ جانے کی وجہ سے پوری عبارت مہمل ہو گئی ہے۔ یہ پتہ لگانا اب غیر ممکن ہے کہ اصل میں کیا تھا۔ کہیں پر کوئی معتبر مخطوطہ ہو تو حال کھلے۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب میں اتنی بڑی غلطی ذرا مشکل سے نظر آئے گی۔ (اس کے برخلاف، آج کل تو کمپیوٹر کے کاتب/کمپوزر پورے پورے پیراگراف چھوڑ جاتے ہیں اور پروف خواں کو خبر نہیں ہوتی۔)

پرانے زمانے کے ٹائپ کے ساتھ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس میں جوڑ بہت کم ممکن ہوتے تھے۔ لہٰذا الفاظ کو پڑھنا تو مشکل ہوتا ہی تھا، یہ ٹائپ جگہ بھی بہت گھیرتا تھا۔ موخرالذکر مشکل کا اثر براہ راست کتاب کی تجارت پر مترتب ہوتا تھا، کیونکہ کھلے کھلے ٹائپ کی چھپائی کی وجہ سے ضخامت، اور پھر قیمت میں اضافہ ہو جانے کے سبب کتاب کی فروخت پر اثر پڑ سکتا تھا۔ ہمارے یہاں ٹائپ کی کتابت کے نامقبول ہونے کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی کتابیں مہنگی اور اس کے حرف غیر دیدہ زیب تھے اور غلطی کا امکان اس میں ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب سے کچھ کم نہ تھا۔

انیسویں صدی میں طباعت کے فروغ کے ساتھ کتاب کے لئے کوئی خاص حجم ضروری نہ رہ گیا تھا، اور کتاب کی تقطیع پر کچھ خاص دھیان نہ دیا جاتا۔ صفحے کا حوض کتنا ہو، یہ بھی اکثر کاتب (اگر ٹائپ کی کتاب ہے تو کمپوزیٹر) کی صوابدید پر منحصر تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کتاب کی تقطیع کے فنی اور صوری حسن، اس کی لاگت اور منافع، وغیرہ، اس کی چھپائی میں متوقع آسانیاں یا مشکلیں، ان باتوں پر اس طرح غور کیا جاتا، یا اصولی فیصلے شروع ہی میں اس طرح لے لئے جاتے کہ کتابت شروع کرتے وقت سب معلوم رہتا کہ کتاب کا حجم کیا ہوگا، صفحے پر کتابت کے لئے حوض کتنا رکھا جائے گا، ضخامت کیا ہوگی۔ اس وقت تو کچھ ایسا

دستور جاری معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت جس ناپ کا کاغذ کارخانے سے آ گیا اسی پر کتاب چھاپ دی گئی۔ اس میں کبھی کبھی کاغذ کا زیاں بھی ہوتا تھا، خاص کر جب کاغذ کا سائز بڑا ہوتا تھا۔ چونکہ پرانی ہی لکھی ہوئی کتابت، یا پرانے جمائے ہوئے پتھر، کو ہی ''نئے'' ایڈیشن کے لئے ممکن حد تک استعمال کر لیتے تھے اور ہر نئے ایڈیشن کے لئے از سر نو کتابت ضروری نہ تھی، اس لئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ کاغذ کا سائز تو بڑا، بلکہ کبھی تو جہازی، رہا لیکن مسطر اسی پرانی کتاب کا رہا اور اس طرح بھی بہت سارا کاغذ ضائع ہوا۔ کبھی کبھی مالک یا مہتمم مطبع کی مرضی ہوئی تو کتاب کے حاشیے کو بھی متن کے استعمال کر لیا گیا۔ اس طرح چھاپنے میں قاری کو دشواری بے شک ہوتی تھی، لیکن شاید اس زمانے تک ایسی دشواریوں کو بے کھٹکے قبول کر لیا جاتا تھا۔

ان تفصیلات سے کچھ اندازہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں چھپی ہوئی کسی کتاب کے بارے میں، جس کی کئی جلدیں ہوں اور وہ جگہ جگہ معرض اشاعت میں آئی ہوں، اور جس میں اصل متن اور غیر متن یک جا ہوں، اس کے صفحات کی صحیح، یا یوں کہیں کہ حقیقت پر مبنی، گنتی بہت مشکل ہے۔ یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب تمام جلدوں کے یکساں ایڈیشن نہ موجود ہوں۔ اگر سب جلدیں یکساں سامنے ہوتیں تو صفحات کی گنتی ایک حد تک آسان ہو جاتی۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ کوئی جلد کسی ایڈیشن کی ہے، کوئی کسی ایڈیشن کی۔ کسی داستان کی کوئی جلد (مثلاً پہلی) کا اول ایڈیشن لکھنوی ہے اور اسی کا ایک اول ایڈیشن کانپوری ہے۔ لازم نہیں کہ دونوں میں صفحات کی تعداد ایک ہی ہو۔ لہٰذا یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کسی جلد میں سچ مچ کتنے صفحے ہیں۔ ہاں الفاظ کی گنتی نسبۃً زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔ میں نے مندرجۂ ذیل فہرست میں ان تمام باتوں کا لحاظ ممکن حد تک رکھا ہے۔

صفحات کی گنتی کے لئے حسب ذیل اصول اختیار کئے گئے ہیں: سرورق اور اشتہار کے صفحات کو شامل کتاب قرار دیا ہے لیکن شامل داستان نہیں قرار دیا ہے۔ اگر بیچ میں یا آخر سے پہلے صفحوں میں کوئی صفحہ خالی یا نصف خالی ہے تو اسے بھی شامل کتاب قرار دیا ہے۔ تقریظ، فہرست مضامین، تاریخ، سبب تالیف کتاب، خود نوشت حالات، وغیرہ کو شامل کتاب اور شامل داستان بھی قرار دیا ہے کہ ان کا تعلق اصل داستان سے بہت قوی ہے۔ الفاظ کی گنتی کا اصول یہ ہے کہ مختلف جگہوں سے چھ صفحات لے کر ہر صفحے کی کسی ایک سطر کے الفاظ پوری احتیاط کے ساتھ شمار کئے گئے ہیں، پھر ان چھ صفحات کی چھ سطروں کی

میزان کر کے اوسط نکالا ہے۔ الفاظ کا یہی اوسط پوری کتاب کے ہر صفحے کے لئے درست قرار دیا ہے اور ایک صفحے کے الفاظ کی تعداد کو اصل داستان کے صفحات سے ضرب دے کر الفاظ کی تعداد متعین کی گئی ہے۔

اب فہرست ملاحظہ ہو۔

**آفتاب شجاعت**، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۱

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۱۹۶ [ناقص الاول]

سرورق کے صفحات: ۲ [؟]

سبب تالیف کتاب اور خاتمۃ الطبع وغیرہ: کم و بیش ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۱۱۹۴

سطریں فی صفحہ: ۳۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۴،۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۱۱۹۴×۲۴،۵×۳۳=۹۶۵۳۴۹ (نو لاکھ پینسٹھ ہزار تین سو انچاس)

**آفتاب شجاعت**، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۳

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۳۳۰

سرورق کے صفحات: ۲

فہرست: ۵،۵ صفحے

اشتہار: ۳ صفحے

سبب تالیف کتاب: ۱ صفحہ

خاتمۃ الطبع: ۰،۵ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۱۳۲۵

سطریں فی صفحہ: ۳۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۲٫۶۶

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۹۹۰۸۰۸٫۵=۱۳۲۵x۲۲٫۶۶x۳۳ (نو لاکھ نوے ہزار آٹھ سو آٹھ اعشاریہ پانچ)

## آفتاب شجاعت، سوم، باراول، لکھنؤ، ۱۹۰۴

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۳۳۶

سرورق کے صفحات: ۲

فہرست: ۵ صفحے

خالی: ۱ صفحہ

اشتہار: ۱ صفحہ

سبب تالیف کتاب: کم وبیش ۲ صفحے

خاتمۃ الطبع وتقریظ: ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۱۳۳۲

سطریں فی صفحہ: ۳۳

اوسط الفاظ فی صفحہ: ۲۲٫۳۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۹۸۱۵۳۷٫۴۸=۱۳۳۲x۲۲٫۳۳x۳۳ (نو لاکھ اکیاسی ہزار پانچ سو سینتیس اعشاریہ چار آٹھ)

## آفتاب شجاعت، چہارم، باراول، لکھنؤ ۱۹۰۵

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۴۶ |
| سرورق کے صفحات: | ۱ |
| اشتہار: | ۱ صفحہ |
| فہرست: | چار صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | ۱ صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۴۴ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۷٫۶۶ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۳×۱۷٫۶۶×۷۴۴=۴۳۳۵۸۸٫۳۲ (چار لاکھ تینتیس ہزار پانچ سو اٹھاسی اعشاریہ تین دو)

## آفتاب شجاعت، پنجم، اول، باراول، لکھنؤ، ۱۹۰۸

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۹۷۸ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| فہرست: | ۴ صفحے |
| خاتمۃ الکتاب والطبع: | ۱ صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۹۷۳ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۸٫۸۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۱۸٫۸۳×۹۷۳=۵۶۷۹۶۹٫۲۹ (پانچ لاکھ

سرسٹھ ہزار نوسو انہتر اعشاریہ دونو )

## آفتاب شجاعت، پنجم، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۸

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۹۸۲ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۱صفحہ |
| فہرست: | ۳صفحے |
| سبب تالیف کتاب: | ۰٫۵صفحہ |
| خاتمۃ الطبع وخاتمۃ الکتاب: | ۰٫۵صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۹۷۹ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۰٫۳۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۳×۲۰٫۳۳×۹۷۹=۶۵۶۸۰۱٫۳۱ ((چھ لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو ایک اعشاریہ تین ایک )

## ایرج نامہ، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۳

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۷۷ |
| سرورق کے صفحات: | ۱ |
| سبب تالیف کتاب: | ۱صفحہ |
| خاتمۃ الطبع: | ۱صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۷۶ |

| | |
|---|---|
| سطریں فی سطر: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۵٫۳۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۵٫۳۳×۷۷۶=۶۰۹۳۳۸٫۴۸ (چھ لاکھ نو ہزار تین سو اڑتیس اعشاریہ چار آٹھ)

**ایرج نامہ**، دوم، بار اول، لکھنؤ، نول کشور، ۱۸۹۸

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۶۴۴ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۶۴۱ |
| فہرست: | چار صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | ۱ صفحہ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۳٫۶۶ |

داستان کے الفاظ کی مجموعی تعداد (تقریباً): ۳۱×۲۳٫۶۶×۶۴۱=۴۷۰۲۴۷٫۸۶ (چار لاکھ ستر ہزار دو سو سینتالیس اعشاریہ آٹھ چھ)

**بالا باختر**، بار دوم، کانپور، ۱۹۰۰

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۸۱۱ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۱ صفحہ |

فہرست مضامین: ۴ صفحے

خاتمۃ الطبع، تقریظ و تاریخ: ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۸۰۸

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۳٫۸

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۳٫۸×۸۰۸=۵۹۶۱۴۲٫۴ (پانچ لاکھ چھیانوے ہزار ایک سو بیالیس اعشاریہ چار)

بقیۂ طلسم ہوش ربا، اول، بار اول، کانپور، ۱۹۱۱

داستان کے مجموعی صفحات: ۷۶۴

سرورق کے صفحات: ۱

سبب تالیف کتاب: ۱ صفحہ

خاتمۃ الطبع: چند سطریں

اصل داستان کے صفحات: ۷۶۳

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۰٫۸۳×۷۶۳=۳۶۵۵۴۵٫۶۷ (تین لاکھ پینسٹھ ہزار پانچ سو پینتالیس اعشاریہ چھ سات)

بقیۂ طلسم ہوشربا، دوم، خدا بخش ایڈیشن، ۱۹۹۳، نول کشور لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۱۱ کی فوٹو کاپی

کتاب کے مجموعی صفحات: ۹۲۵

سرورق کے صفحات: ۲

تاریخ، تقریظ، خاتمۃ الطبع: ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۹۲۳

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰،۵

داستان کے الفاظ کی مجموعی تعداد (تقریباً): ۲۳×۲۰،۵×۹۲۳=۴۳۵۱۹۴،۵ (چار لاکھ پینتیس ہزار ایک سو چورانوے اعشاریہ پانچ)

## تورج نامہ، اول، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۰۶

کتاب کے مجموعی صفحات: ۷۷۶

سرورق کے صفحات: ۱

سبب تالیف کتاب: ۱،۵ صفحے

تاریخ و تقریظ و خاتمۃ الطبع: ۲،۵ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۷۷۵

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰،۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۰،۸۳×۷۷۵=۵۰۰۴۴۰،۲۵ (پانچ لاکھ چار سو چالیس اعشاریہ دو پانچ)

### تورج نامہ،دوم،بارسوم،لکھنؤ،۱۹۲۷

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۲۹۲ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳صفحے |
| فہرست مضامین: | ۴صفحے |
| عرض مولف،خاتمۃ الطبع: | ۰٫۵صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۱۲۸۷ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۲ |

اصل داستان کے الفاظ(تقریباً): ۳۱×۲۲×۱۲۸۷=۸۷۷۷۳۴(آٹھ لاکھ ستتر ہزار سات سو چونتیس)

### صندلی نامہ،باردوم،لکھنؤ،۱۹۰۱

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۴۷۲ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۱صفحہ |
| سبب تالیف کتاب: | کم وبیش ۱صفحہ |
| خاتمہ،تاریخ،تقریظ: | ۳صفحات |
| اصل داستان کے صفحات: | ۴۶۹ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۱٫۸۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۱٫۸۳×۴۶۹=۳۱۷۳۸۶٫۳۷ (تین لاکھ سترہ ہزار تین سو چھیاسی اعشاریہ تین سات)

## طلسم خیال سکندری، اول، غالباً بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۷

کتاب کے مجموعی صفحات: ۸۹۲ [ناقص الآخر]

سرورق کے صفحات: ۱

سبب تالیف کتاب: کم و بیش اصفحہ

تقریظ و تاریخ: کم و بیش اصفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۸۹۱

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰٫۱۶

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۰٫۱۶×۸۹۱=۴۱۳۱۳۸٫۸۸ (چار لاکھ تیرہ ہزار ایک سو اڑتیس اعشاریہ آٹھ آٹھ

## طلسم خیال سکندری، دوم، غالباً بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۷

کتاب کے مجموعی صفحات: ۹۶۸ [ناقص الآخر]

سرورق کے صفحات: ۱

اصل داستان کے صفحات: ۹۶۷

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۷٫۱۶

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۶،۱۷×۹۶۷=۳۸۱۶۵۵،۵۶ (تین لاکھ اکیاسی ہزار چھ سو پچپن اعشاریہ پانچ چھ)

## طلسم خیال سکندری، سوم، بار اول؟ لکھنؤ؟ ۱۸۹۷؟

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۰۶۴ [ناقص الآخر]

سرورق کے صفحات: ۱

اصل داستان کے صفحات: ۱۰۶۳

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۸

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۱۸×۲۳×۱۰۶۳=۴۴۰۰۸۲ (چار لاکھ چالیس ہزار بیاسی)

## طلسم زعفران زار سلیمانی، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۵

کتاب کے مجموعی صفحات: ۹۲۰

فہرست مضامین: ۴ صفحے

سرورق کے صفحات: ۱

خاتمۃ الطبع: ۰،۵ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۹۱۹

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۶،۱۷

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۱۶٫۱۷×۲۳×۹۲۰=۳۶۳۱۰۵٫۶ (تین لاکھ ترسیٹھ ہزار ایک سو پانچ اعشاریہ چھ)

## طلسم زعفران زار سلیمانی، دوم، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۰۵

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۸۵ |
| اشتہار | ۱ صفحہ |
| فہرست مضامین: | ۸ صفحے |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| سبب تالیف کتاب: | دو صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | نصف صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۸۲ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۸٫۶۶ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۸٫۶۶×۷۸۲=۳۳۵۶۱۸٫۷۶ (تین لاکھ پینتیس ہزار چھ سو اٹھارہ اعشاریہ سات چھ)

## طلسم فتنۂ نور افشاں، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۶

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۳۰ |
| اشتہار: | ۱ صفحہ |
| فہرست مضامین: | ۲ صفحے |

| | |
|---|---|
| سرورق کے صفحات: | ۲ صفحے |
| تقریظ و تاریخ: | کم و بیش ا صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۲۷ |
| الفاظ فی سطر: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۴٫۳۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریبا): ۳۱×۲۴٫۳۳×۷۲۷=۵۴۸۳۲۵٫۲۱ (پانچ لاکھ اڑتالیس ہزار تین سو پچیس اعشاریہ دو ایک)

## طلسم فتنہ نور افشاں، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۶

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۹۱۶ |
| سرورق کے صفحات: | ۱ |
| سبب تصنیف کتاب: | ۰٫۵ صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۹۱۵ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۱٫۸۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریبا) ۳۱×۲۱٫۸۳×۹۱۵=۶۱۹۲۰۷٫۹۵ (چھ لاکھ انیس ہزار دو سو سات اعشاریہ نو پانچ)

## طلسم فتنہ نور افشاں، سوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۶

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۰۴۰ [ناقص الاول] |

سرورق: ۲؟

اشتہار: ۳ صفحے

تقریظ، تاریخ ہا، خاتمۃ الطبع: ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات : ۱۰۳۵

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۶۶۸۳۳۰٫۵۵=۱۰۳۵×۲۰٫۸۳×۳۱ (چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار تین سو تیس اعشاریہ پانچ پانچ)

## طلسم نوخیز جمشیدی، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۱

کتاب کے مجموعی صفحات: ۷۹۰

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۱ صفحہ

تقریظ و تاریخ: ۵٫۱ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۷۸۷

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۶٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ، (تقریباً): ۳۰۴۶۳۹٫۸۳=۷۸۷×۱۶٫۸۳×۲۳ (تین لاکھ چار ہزار چھ سو انتالیس اعشاریہ آٹھ تین)

## طلسم نوخیز جمشیدی، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۲

کتاب کے مجموعی صفحات: ۷۵۸

سرورق کے صفحات: ۲

فہرست: ۱ صفحہ

تقریظ و تاریخ: ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۷۵۵

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۹٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ، (تقریبا): ۲۳×۱۹٫۸۳×۷۵۵=۳۴۴۳۴۷٫۹۵ (تین لاکھ چوالیس ہزار تین سو سینتالیس اعشاریہ نو پانچ)

## طلسم نوخیز جمشیدی، سوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۲

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۰۲۰

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۱ صفحہ

خاتمۃ الطبع و تقریظ و تاریخ: ۲ صفحے کم و بیش

اصل داستان کے صفحات: ۱۰۱۷

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۱۸٫۳۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریبا): ۲۳×۱۸٫۳۳×۱۰۱۷=۴۲۸۷۵۷٫۰۳ (چار لاکھ

اٹھائیس ہزار سات سو ستاون اعشاریہ صفر تین)

طلسم ہفت پیکر، اول، بار سوم، لکھنؤ، ۱۹۰۹

کتاب کے مجموعی صفحات: ۷۱۴

سرورق کے صفحات: ۲

فہرست مضامین: ۲ صفحے

اشتہار: ۳ صفحے

تقریظ و تاریخ: ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۷۰۹

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی صفحہ: ۲۰،۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۰،۸۳×۷۰۹=۳۳۹۶۷۴،۸۱ (تین لاکھ اُنتالیس ہزار چھ سو چوہتر اعشاریہ آٹھ ایک)

طلسم ہفت پیکر، دوم، بار دوم [؟] لکھنؤ، ۱۹۱۵

کتاب کے مجموعی صفحات: ۸۵۸

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳ صفحے

تقریظ و تاریخ: ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۸۵۳

سطریں فی صفحہ: ۲۳

| | |
|---|---|
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۱٫۶۶ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۱٫۶۶×۸۵۳ = ۴۲۴۹۴۷٫۵۴ (چار لاکھ چوبیس ہزار نوسو سینتالیس اعشاریہ پانچ چار)

## طلسم ہفت پیکر، سوم، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۱۳

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۲۶۴ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| تاریخ و تقریظ: | ۲ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۱۲۵۷ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۰٫۳۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۰٫۳۳×۱۲۵۷ = ۵۸۷۷۶۰٫۶۳ (پانچ لاکھ ستاسی ہزار سات سو ساٹھ اعشاریہ چھ تین)

## طلسم ہوش ربا، اول، بار ہشتم، لکھنؤ، ۱۹۳۰

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۹۰۰ |
| سرورق کے صفحات: | ۱ |
| تقریظ و تاریخ و خاتمۃ الطبع: | ۹ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۸۹۹ |

سطریں فی صفحہ: ۲۵

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۲

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۵×۲۲×۸۸۹=۴۸۸۹۵۰ (چار لاکھ اٹھاسی ہزار نو سو پچاس)

## طلسم ہوش ربا، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۴

کتاب کے مجموعی صفحات: ۹۶۴

سرورق کے صفحات: ۱

تقریظ و تاریخ: (کم و بیش) ۷ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۹۶۳

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۱٫۶۱

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۱٫۶۱×۹۶۳=۶۴۵۱۲۳٫۳۳ (چھ لاکھ پینتالیس ہزار ایک سو تئیس اعشاریہ تین تین)

## طلسم ہوش ربا، سوم، بار دوم، لکھنؤ، ۱۸۹۲

کتاب کے مجموعی صفحات: ۹۲۲

سرورق کے صفحات: ۱

تقریظ و تاریخ: کم و بیش ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۹۲۱

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۱٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۱٫۸۳×۹۲۱=۴۶۲۴۲۴٫۸۹ (چار لاکھ باسٹھ ہزار چار سو چوبیس اعشاریہ آٹھ نو)

## طلسم ہوش ربا، چہارم، بار اول، کانپور، ۱۹۱۳

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۲۸۲

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۲ صفحے

خاتمۃ الطبع: ۱ صفحہ

تاریخ: ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۱۲۷۸

سطریں فی صفحہ: ۲۷

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۲٫۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۷×۲۲٫۵×۱۲۷۸=۷۷۶۳۸۵ (سات لاکھ چھہتر ہزار تین سو پچاسی)

## طلسم ہوش ربا، پنجم، حصۂ اول، بار دوم، لکھنؤ، ۱۸۹۳

کتاب کے مجموعی صفحات: ۸۳۸

سرورق کے صفحات: ۲

| | |
|---|---|
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| فہرست مضامین: | ۲ صفحے |
| تمہید و التماس بخدمت ناظرین: | ۲،۵ صفحے |
| تقریظ، تاریخ، خاتمۃ الطبع: | ۵ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۸۳۳ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۹ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۹×۸۳۳=۳۶۴۰۲۱ (تین لاکھ چونسٹھ ہزار اکیس)

## طلسم ہوش ربا پنجم، حصہ دوم، بار دوم، لکھنؤ، ۱۸۹۳

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۸۸۹ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| تاریخ و تقریظ: | ۳ صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | ۱ صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۸۸۴ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۹،۸۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۹،۸۳×۸۸۴=۴۰۳۱۸۳،۵۶ (چار لاکھ تین ہزار ایک سو تراسی اعشاریہ پانچ چھ)

طلسم ہوشربا، ششم، باردوم، کانپور، ۱۸۹۳

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۳۷۷ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ صفحے |
| اشتہار: | ۴ صفحے |
| فہرست مضامین: | ۴ صفحے |
| حالات خودنوشت: | کم وبیش ا صفحہ |
| خلاصۂ مضمون جلد ہفتم: | ۲ صفحے |
| التماس بخدمت ناظرین وتقریظ وتاریخ ہا: | ۳ صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | ا صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۱۳۷۱ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| االفاظ فی سطر: | ۱۶٫۲۲ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۶٫۲۲×۱۳۷۱=۵۱۱۴۶۵٫۲۶ (پانچ لاکھ گیارہ ہزار چارسو پینسٹھ اعشاریہ دو چھ)

طلسم ہوش ربا، ہفتم، بارسوم، کانپور، ۱۹۱۵

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۰۸۰ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| تقریظ وتاریخ ہا: | ۹ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۱۰۷۵ |

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۰،۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۲۰،۵×۱۰۷۵=۵۰۶۸۶۲،۵۰ (پانچ لاکھ چھ ہزار آٹھ سو باسٹھ اعشاریہ پانچ)

## کوچک باختر، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۰۱

کتاب کے مجموعی صفحات: ۷۰۰

سرورق وغیرہ کے صفحات: ۲

اشتہار: ۱ صفحہ

فہرست مضامین: ۴ صفحے

سبب تالیف کتاب: نصف صفحہ

خاتمۃ الطبع: نصف صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۶۹۷

سطریں فی صفحہ: ۲۳

اوسط الفاظ فی سطر ۲۶،۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً) ۲۳:×۲۶،۵×۶۹۷=۴۲۴۸۲۱،۵۰ (چار لاکھ چوبیس ہزار آٹھ سو اکیس اعشاریہ پانچ)

## گلستان باختر، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۹

کتاب کے مجموعی صفحات: ۶۸۳

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳صفحے

فہرست: ۴صفحے

اصل داستان کے صفحات : ۶۷۸

سطریں فی صفحہ: ۳۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۱٫۶۶

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۳×۲۱٫۶۶×۶۷۸ = ۴۸۴۶۲۰٫۸۴ (چار لاکھ چوراسی ہزار چھ سو بیس اعشاریہ آٹھ چار)

## گلستان باختر، دوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۹

کتاب کے مجموعی صفحات: ۶۶۰

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳صفحے

فہرست: ۴صفحے

خاتمۃ الطبع: ۱صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۶۵۵

سطریں فی صفحہ: ۳۳

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۱٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۳×۲۱٫۸۳×۶۵۵ = ۴۷۱۸۵۵٫۴۵ (چار لاکھ اکہتر ہزار آٹھ سو پچپن اعشاریہ چار پانچ)

**گلستان باختر**، سوم، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۱۷

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۸۵۲[ ناقص الآخر] |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحات |
| فہرست: | ۳ صفحات |
| اصل داستان کے صفحات: | ۸۴۷ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۳٫۳۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۳×۲۳٫۳۳×۸۴۷ = ۶۵۲۰۹۶٫۸۳ (چھ لاکھ باون ہزار چھیانوے اعشاریہ آٹھ تین)

**لعل نامہ**، اول، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۳۱

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۸۷۶ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۸۷۱ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۲٫۶۶ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۲٫۶۶×۸۷۱=۶۱۱۸۴۲٫۶۶ (چھ لاکھ

گیارہ ہزار آٹھ سو بیالیس اعشاریہ چھیاسٹھ)

**لعل نامہ**، دوم، بار دوم، لکھنؤ، ۱۹۱۷

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۱۰۱۴ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| خاتمۃ الطبع: | ۰٫۵ صفحہ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۱۰۰۹ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۲٫۳۳ |

کل داستان کے الفاظ: ۲۲٫۳۳×۳۱×۱۰۰۹=۶۹۸۴۶۰٫۰۷ (چھ لاکھ اٹھانوے ہزار چار سو ساٹھ اعشاریہ صفر سات)

**نوشیرواں نامہ**، اول، بار اول، لکھنؤ، ۱۸۹۳

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۷۸ |
| سرورق کے صفحات: | ۲ |
| اشتہار: | ۳ صفحے |
| فہرست: | ۴ صفحے |
| تاریخ، خاتمۃ الطبع: | ۳ صفحے |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۷۳ |
| سطریں فی صفحہ: | ۳۱ |

اوسط الفاظ فی سطر: ۲۱٫۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۱٫۵×۷۷۳=۵۱۵۲۰۴٫۵۰ (پانچ لاکھ پندرہ ہزار دو سو چار اعشاریہ پانچ)

**نوشیرواں نامہ**، دوم، بار سوم، لکھنؤ، ۱۹۱۵

کتاب کے مجموعی صفحات: ۸۰۴

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳ صفحے

خاتمۃ الطبع: ۲ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۷۹۹

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی صفحہ: ۲۲٫۶۶

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۳۱×۲۲٫۶۶×۷۹۹=۵۶۱۲۶۵٫۵۴ (پانچ لاکھ اکسٹھ ہزار دو سو پینسٹھ اعشاریہ پانچ چار)

**ہرمز نامہ**، بار اول، لکھنؤ، ۱۹۰۱

کتاب کے مجموعی صفحات: ۱۱۹۹

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳ صفحے

فہرست: ۴ صفحے

تقریظ: ۰٫۵ صفحے

اصل داستان کے صفحات: ۱۱۹۴

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی صفحہ: ۲۰٫۵

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۱۱۹۴×۲۰٫۵×۳۱=۷۵۸۷۸۷ (سات لاکھ اٹھاون ہزار سات سو ستاسی)

**ہومان نامہ**، باراول، لکھنؤ، ۱۹۰۱

کتاب کے مجموعی صفحات: ۸۱۸

سرورق کے صفحات: ۲

اشتہار: ۳ صفحے

فہرست: ۴ صفحے

تقریظ، تاریخ: ۱ صفحہ

اصل داستان کے صفحات: ۸۱۳

سطریں فی صفحہ: ۳۱

اوسط الفاظ فی صفحہ: ۲۰٫۸۳

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۸۱۳×۲۰٫۸۳×۳۱=۵۲۴۹۷۸٫۴۹ (پانچ لاکھ چوبیس ہزار نو سو اٹھتر اعشاریہ چار نو)

ان اعداد کو نقشے کی صورت میں ظاہر کریں تو حسب ذیل صورت بنتی ہے:

| نام داستان | مجموعی صفحات | اصل داستان کے صفحات | الفاظ |
|---|---|---|---|

| | | | |
|---|---|---|---|
| آفتاب شجاعت اول | ۱۱۹۶ | ۱۱۹۴ | ۹۶۵۳۴۹٫۰۰ |
| آفتاب شجاعت، دوم | ۱۳۳۰ | ۱۳۲۵ | ۹۹۰۸۰۸٫۵۰ |
| آفتاب شجاعت، سوم | ۱۳۳۶ | ۱۳۳۲ | ۹۸۱۵۳۷٫۴۸ |
| آفتاب شجاعت، چہارم | ۷۴۶ | ۷۴۴ | ۴۳۳۵۸۸٫۳۲ |
| آفتاب شجاعت، پنجم، اول | ۹۷۸ | ۹۷۳ | ۵۶۷۹۶۹٫۲۹ |
| آفتاب شجاعت، پنجم، دوم | ۹۸۲ | ۹۷۹ | ۶۵۶۸۰۱٫۳۱ |
| ایرج نامہ، اول | ۷۷۷ | ۷۷۶ | ۶۰۹۳۳۸٫۴۳ |
| ایرج نامہ، دوم | ۶۴۴ | ۶۴۱ | ۴۷۰۲۴۷٫۸۶ |
| بالا باختر | ۸۱۱ | ۸۰۸ | ۵۹۶۱۴۲۴۰ |
| بقیۂ طلسم ہوش ربا، اول | ۷۶۴ | ۷۶۳ | ۳۶۵۵۴۵٫۶۷ |
| بقیۂ طلسم ہوش ربا، دوم | ۹۲۵ | ۹۲۳ | ۴۳۵۱۹۴٫۵۰ |
| تورج نامہ، اول | ۷۷۶ | ۷۷۵ | ۵۰۰۴۴۰٫۲۵ |
| تورج نامہ، دوم | ۱۱۹۲ | ۱۲۸۷ | ۷۷۷۷۳۴٫۰ |
| صندلی نامہ | ۴۷۲ | ۴۶۹ | ۳۱۷۳۸۶٫۳۷ |
| طلسم خیال سکندری، اول | ۸۹۲ | ۸۹۱ | ۴۱۳۱۳۸٫۸۸ |
| طلسم خیال سکندری، دوم | ۹۶۸ | ۹۶۷ | ۳۸۱۶۵۵٫۵۶ |
| طلسم خیال سکندری، سوم | ۱۰۶۴ | ۱۰۶۳ | ۴۴۰۰۸۲٫۰۰ |
| طلسم زعفران زار سلیمانی، اول | ۹۲۰ | ۹۱۹ | ۳۶۳۱۰۵٫۶۰ |
| طلسم زعفران زار سلیمانی، دوم | ۷۸۵ | ۷۸۲ | ۳۳۵۶۱۸٫۷۶ |
| طلسم فتنۂ نور افشاں، اول | ۷۳۰ | ۷۲۷ | ۵۴۸۳۲۵٫۲۱ |
| طلسم فتنۂ نور افشاں، دوم | ۹۱۶ | ۹۱۵ | ۶۱۹۲۰۷٫۹۵ |
| طلسم فتنۂ نور افشاں، سوم | ۱۰۴۰ | ۱۰۳۵ | ۶۶۸۳۳۰٫۵۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| طلسم نوخیز جمشیدی، اول | ۷۹۰ | ۷۸۷ | ۳۰۴۶۳۹٫۸۳ |
| طلسم نوخیز جمشیدی، دوم | ۷۵۸ | ۷۵۵ | ۳۴۴۳۴۷٫۹۵ |
| طلسم نوخیز جمشیدی، سوم | ۱۰۲۰ | ۱۰۱۷ | ۴۲۸۷۵۷٫۰۳ |
| طلسم ہفت پیکر، اول | ۷۱۴ | ۷۰۹ | ۳۳۹۶۷۴٫۸۱ |
| طلسم ہفت پیکر، دوم | ۸۵۸ | ۸۵۳ | ۴۲۴۹۴۷٫۵۴ |
| طلسم ہفت پیکر، سوم | ۱۲۶۲ | ۱۲۵۷ | ۵۸۷۷۶۰٫۶۳ |
| طلسم ہوش ربا، اول | ۹۰۰ | ۸۹۹ | ۴۹۴۴۵۰٫۰۰ |
| طلسم ہوش ربا، دوم | ۹۶۴ | ۹۶۳ | ۶۴۵۱۲۳٫۳۳ |
| طلسم ہوش ربا، سوم | ۹۲۲ | ۹۲۱ | ۴۶۲۴۲۴٫۸۹ |
| طلسم ہوش ربا، چہارم | ۱۲۸۲ | ۱۲۷۸ | ۷۷۶۳۸۵٫۰۰ |
| طلسم ہوش ربا، پنجم، اول | ۸۳۸ | ۸۳۳ | ۳۶۴۰۲۱٫۰۰ |
| طلسم ہوش ربا پنجم، دوم | ۸۸۹ | ۸۸۴ | ۴۰۳۱۸۳٫۵۶ |
| طلسم ہوش ربا، ششم | ۱۳۷۷ | ۱۳۷۱ | ۵۱۱۴۶۵٫۲۶ |
| طلسم ہوش ربا، ہفتم | ۱۰۸۰ | ۱۰۷۵ | ۵۰۶۸۶۲٫۵۰ |
| کوچک باختر | ۷۰۰ | ۶۹۷ | ۴۲۴۸۲۱٫۵۰ |
| گلستان باختر، اول | ۶۸۳ | ۶۷۸ | ۴۸۴۶۲۰٫۸۴ |
| گلستان باختر، دوم | ۶۶۰ | ۶۵۵ | ۴۷۱۸۵۵٫۴۵ |
| گلستان باختر، سوم | ۸۵۲ | ۸۴۷ | ۶۵۲۰۹۶٫۸۳ |
| لعل نامہ، اول | ۸۷۶ | ۸۷۱ | ۶۱۱۸۴۲٫۶۶ |
| لعل نامہ، دوم | ۱۰۱۴ | ۱۰۰۹ | ۶۹۸۴۶۰٫۰۷ |
| نوشیرواں نامہ، اول | ۷۷۸ | ۷۷۳ | ۵۱۵۲۰۴٫۵۰ |
| نوشیرواں نامہ، دوم | ۸۰۴ | ۷۹۹ | ۵۶۱۲۶۵٫۵۴ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ہرمزنامہ | ۱۱۹۹ | ۱۱۹۴ | ۷۵۸۷۸۷٫۰۰ |
| ہومان نامہ | ۸۱۸ | ۸۱۳ | ۵۲۴۹۷۸٫۴۹ |

میزان:

مجموعی صفحات ۴۲۲۸۲ (بیالیس ہزار دو سو بیاسی)

اصل داستان کے صفحات ۴۲۱۲۲ (بیالیس ہزار ایک سو بائیس)

اصل داستان کے الفاظ ۲۴۱۰۶۰۰٫۰۲ (دو کروڑ اکتالیس لاکھ چھ ہزار اعشاریہ صفر دو

مندرجہ بالا نقشے کو بنانے کے دوران کئی باتیں ظاہر ہوئیں:

(۱) راز یزدانی نے جو پینتالیس ہزار صفحات کا تخمینہ لگایا تھا تو وہ بہت غلط نہ تھا۔

(۲) لیکن محض صفحات گننے سے داستان کی اصل ضخامت اور حجم کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں دو مشکلیں ہیں:

ایک تو یہ کہ کس صفحے کو ''داستان'' کا صفحہ کہا جائے؟ سر ورق کو داستان کا صفحہ نہ مانیں، لیکن تقریظ، فہرست، یا خود مصنف کے عرض حال کو داستان کے صفحات میں شمار کریں کہ نہیں؟ پھر آغاز داستان میں کئی صفحے، اور کبھی کبھی بہت کم صفحے، حمد و نعت و منقبت کے ہوتے ہیں۔ ان کو شامل داستان سمجھیں یا نہیں؟ جیسا کہ ظاہر ہوا ہوگا، میں نے اشتہار اور سر ورق کے سوا ہر صفحے کو داستان کا صفحہ مانا ہے۔ لیکن یہ ذاتی فیصلہ ہے، دوسروں کی رائے مختلف ہوسکتی ہے۔ بعض لوگ اشتہار اور سر ورق کو بھی داستان کے صفحات میں شمار کریں گے اور بعض شاید فہرست یا تقریظ کو خارج از شمار رکھیں۔

دوسری بات یہ کہ سب جلدیں ایک ہی تقطیع (کتاب کے صفحے کی لمبائی چوڑائی) کی نہیں ہیں اور نہ سب جلدوں کے مسطر (ایک صفحے پر سطروں کی تعداد) ایک ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہے کہ دو

کتابوں کی تقطیع ایک ہے لیکن حوض (صفحے پر وہ رقبہ جس پر کتابت کی جاتی ہے) یکساں نہیں، یعنی تقطیع ایک ہے لیکن حاشیہ ایک نہیں۔ نہ ہی سب جلدوں کی لکھائی پاشانی (بکھراؤ، یعنی لفظوں کے درمیان عام سے زیادہ جگہ ہونا) یا گٹھاؤ (لفظوں کے درمیان کم سے کم جگہ رکھنا) کے لحاظ سے یکساں ہے۔

(۳) بعض جگہ ایک ہی جلد میں کئی کاتبوں کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ یہاں اگر چہ مسطر پوری جلد میں یکساں ہے، لیکن ہر کتاب کا سواد خط مختلف ہونے کی وجہ سے سطر میں الفاظ کی تعداد بھی یکساں نہیں رہ گئی ہے، اور بعض اوقات ایک ہی کاتب نے بعض صفحے گٹھے ہوئے لکھے ہیں اور بعض پاشاں لکھے ہیں۔

(۴) لہٰذا یہ تو ظاہر ہے کہ صفحات گننے سے داستان کی ضخامت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن الفاظ کو اوسطاً گننے سے بھی پوری طرح تشفی بخش فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ صفحات میں الفاظ کی اوسط تعداد کا شمار مسطر کی ناہمواری، کاتب کے سواد خط، اور ممکن ہے اس کی لاپروائی یا مجبوری کے سبب سے کتابت میں نابرابری، وغیرہ کے سبب سے بہر حال تھوڑا بہت غیر قطعی رہے گا۔

مسئلہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ الفاظ کو گننے میں سب سے بڑی مشکل اس بات کا تعین ہے کہ کس ملفوظ کو ''لفظ'' مانا جائے؟ مثال کے طور پر:

دیکھ کر جاؤں گا

کو دو لفظ مانیں کہ تین، کہ چار؟ خیر، یہاں تو ایک اصول طے کر لیں، کہ یہ دو لفظ ہیں (یا تین یا چار ہیں) اور اسی حساب سے گنتے چلے جائیں۔ لیکن اضافتوں اور مرکب الفاظ کا معاملہ اتنا آسان نہیں۔ مثال کے طور پر:

ہموار؛ ناہموار؛ باد بہاری؛ از خود رفتہ

کو چار لفظ، یا پانچ لفظ، سات لفظ، یا نو لفظ، غرض بہت طرح سے فرض کر سکتے ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لئے ''نوشیرواں نامہ'' جلد اول، نو کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۳ کا ایک صفحہ یوں ہی کھولتا ہوں۔ یہ صفحہ ۳۱۸ ہے۔ اب وسط صفحہ سے یہ عبارت ملاحظہ ہو:

> بڑا فساد ہوگا اور بہت بڑی خونریزی ہوگی مفت میں سب لوگ قتل ہو جائیں گے
> لندھور نے غصہ ہو کر کہا کہ تم لوگ کیا بکتے ہو انشاء اللہ بتائید ربانی و بہ افضال یزدانی
> اس دیو مردم خوار کو مارتا ہوں اور قفل باغ کا توڑ کر اسلحۂ سلمان بن طلحہ کو اپنے قبضے

اپنے قبضے میں کرتا ہوں یہ کہہ کے لندھور بن سعدان شاہ نے...

میں جس حساب سے اس عبارت کے الفاظ شمار کروں گا، اس کی تفصیل، دوسرے ممکن شمارات کے ساتھ لکھتا ہوں۔ ممکن شمارات چوکھٹے دروازوں [ ] میں ہیں:

بڑا فساد ہوگا = تین [چار]

اور بہت بڑی خوں ریزی ہوگی = پانچ [چھ؛ سات]

مفت میں لوگ قتل ہو جائیں گے = سات [چھ]

لندھور نے غصہ ہو کر کہا = پانچ [چھ]

کہ تم لوگ کیا بکتے ہو = چھ [پانچ]

انشاء اللہ بتائید ربانی = چار [پانچ؛ تین]

و بہ افضال یزدانی = چار [چار]

اس دیو مردم خوار کو مارتا ہوں = سات [پانچ، چھ]

اور قفل باغ کا توڑ کر = چھ [پانچ]

اسلحۂ سلمان بن طلحہ کو اپنے قبضے = پانچ [سات]

میں ابھی کرتا ہوں = چار [تین]

یہ کہہ کے لندھور بن سعدان شاہ = سات [پانچ، چار، تین]

یہ ملحوظ رہے کہ اس عبارت میں کوئی پیچیدہ تراکیب نہیں ہیں (جیسے ''از خود رفتہ'') جن کے بارے میں فیصلہ عام سے زیادہ مشکل ہو۔ اگر ایسی عبارت ہو جس میں پیچیدہ تراکیب اور آپس میں الجھی ہوئی تراکیب ہوں (جیسے غالب کا مصرع ہے ع آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے)، تو فیصلہ اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا الفاظ کی تعداد کا تخمینہ جو میں نے اوپر پیش کیا ہے (سوا دو کروڑ سے اوپر الفاظ)، وہ تخمینہ در تخمینہ ہے۔ یعنی الفاظ کی تعداد طریقۂ شمار کے اعتبار سے بھی بدلے گی۔ چنانچہ اوپر جو گنتیاں میں نے درج کی ہیں ان کے اعتبار سے میری نقل کردہ عبارت میں الفاظ کی تعداد ۶۷، ۶۲، ۶۱، اور ۶۳ بنتی ہے۔ اور جب اتنی مختصر عبارت میں اتنا فرق ہے تو ڈھائی کروڑ الفاظ میں یہ فرق پندرہ بیس لاکھ

تک پہنچ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ داستان کا حجم متعین کرنے کا سب سے اچھا طریقہ اس کی الفاظ شماری ہے، لیکن مختلف اصول شمار کے اعتبار سے الفاظ کی مجموعی تعداد کچھ نہ کچھ ضرور بدلے گی۔ فی الحال جو طریقے استعمال کئے گئے ہیں ان کے اعتبار سے داستان کے مجموعی صفحات ۴۲۲۸۲ (بیالیس ہزار دو سو بیاسی)، اصل داستان کے صفحات ۴۲۱۲۲ (بیالیس ہزار ایک سو بائیس)، اور اصل داستان کے الفاظ کم و بیش ۲۴۱۰۶۰۰،۰۲ (دو کروڑ اکتالیس لاکھ چھ ہزار اعشاریہ صفر دو) ہیں۔ شیخ حسن سجزی دہلوی کا کیا خوب شعر ہے۔

گفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی

من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند

داستان امیر حمزہ طویل بھی عاشق کے دل کا حال ہی تھی، کہ اس بستار (انجھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت، میر) کے باوجود بہ پایاں نہ پہنچی ☆☆

باب چہارم

# تاریخ اشاعت، ترتیب و تصنیف داستان

پروفیسر گیان چند نے جہاں داستان کی بہت سی خدمات انجام دی ہیں، وہاں انھوں نے ہر جلد کی اولین تاریخ اشاعت متعین کرنے میں بھی بہت کاوش کی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی متعین کردہ تاریخیں آج کی معلومات کی روشنی میں بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ صرف ایک آدھ جگہ بہت معمولی ترمیم کی ضرورت مجھے محسوس ہوئی ہے۔ ذیل کے نقشے میں گیان چند کی متعین کردہ تاریخ اور اس کے آگے میری متعین کردہ تاریخ درج ہیں، بشرطیکہ میری تاریخ اور گیان چند کی متعین کردہ تاریخ میں اختلاف ہو۔ جہاں اختلاف نہیں ہے، وہاں ایک ہی تاریخ لکھی ہے۔ اس نقشے میں جلدوں کے نام اسی ترتیب سے لکھے گئے ہیں جس ترتیب سے نول کشوری فہرستوں میں وہ نظر آتے ہیں:

| | | گیان چند | فاروقی |
|---|---|---|---|
| (۱) | نوشیرواں نامہ، اول | ۱۸۹۳ | |
| (۲) | نوشیرواں نامہ، دوم | ۱۸۹۳ | ۱۸۹۸ |
| (۳) | ہرمز نامہ | ۱۹۰۰ | |
| (۴) | ہومان نامہ | ۱۹۰۱ | |
| (۵) | کوچک باختر | بعد ۱۸۹۲ | |
| (۶) | بالا باختر | بعد ۱۸۹۲ | ۱۸۹۹ |
| (۷) | ایرج نامہ، اول | بعد ۱۸۹۲ | ۱۸۹۳ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۸) | ایرج نامہ، دوم | بعد ۱۸۹۲ | ۱۸۹۳؟ |
| (۹) | طلسم ہوشربا، جلد اول | ۱۸۸۱ | ۱۸۸۳ |
| (۱۰) | طلسم ہوشربا، جلد دوم | ۱۸۸۴ | |
| (۱۱) | طلسم ہوشربا، جلد سوم | ۱۸۸۸/۱۸۸۹ | |
| (۱۲) | طلسم ہوشربا، جلد چہارم | تاریخ درج نہیں | ۱۸۹۰ |
| (۱۳) | طلسم ہوشربا، جلد پنجم، اول | ۱۸۹۱ | |
| (۱۴) | طلسم ہوشربا، جلد پنجم، دوم | ۱۸۹۱ | |
| (۱۵) | طلسم ہوشربا، جلد ششم | ۱۸۹۲ | |
| (۱۶) | طلسم ہوشربا، جلد ہفتم | ۱۸۹۲یا۱۸۹۳ | ۱۸۹۳؟ |
| (۱۷) | صندلی نامہ | ۱۸۹۵ | |
| (۱۸) | تورج نامہ، اول | تاریخ درج نہیں | ۱۸۹۶ |
| (۱۹) | تورج نامہ، دوم | تاریخ درج نہیں | ۱۸۹۷؟ |
| (۲۰) | لعل نامہ اول | ۱۸۹۶ | |
| (۲۱) | لعل نامہ اول | ۱۸۹۶ | ۱۸۹۷ |
| (۲۲) | آفتاب شجاعت، جلد اول | ۱۹۰۳تا۱۹۰۸ | ۱۹۰۱ |
| (۲۳) | آفتاب شجاعت، جلد دوم | ایضاً | ۱۹۰۳ |
| (۲۴) | آفتاب شجاعت، جلد سوم | ایضاً | ۱۹۰۴ |
| (۲۵) | آفتاب شجاعت، جلد چہارم | ایضاً | ۱۹۰۵ |
| (۲۶) | آفتاب شجاعت، جلد پنجم، اول | ایضاً | ۱۹۰۸ |
| (۲۷) | آفتاب شجاعت، جلد پنجم، دوم | ایضاً | ۱۹۰۸ |
| (۲۸) | گلستان باختر، جلد اول | ۱۹۰۶ | ۱۹۰۹ |
| (۲۹) | گلستان باختر، جلد دوم | ۱۹۰۶ | ۱۹۰۹ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۳۰) | گلستان باختر، جلد سوم | ۱۹۱۷ | |
| (۳۱) | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد اول | ۱۸۹۶ | |
| (۳۲) | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد دوم | ۱۸۹۶ | |
| (۳۳) | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد سوم | ۱۸۹۶ | |
| (۳۴) | بقیہ طلسم ہوشربا، جلد اول | ۱۸۹۷ | |
| (۳۵) | بقیہ طلسم ہوشربا، جلد دوم | ۱۸۹۷ | |
| (۳۶) | طلسم ہفت پیکر، جلد اول | ۱۸۹۷ | |
| (۳۷) | طلسم ہفت پیکر، جلد دوم | ۱۸۹۷ | |
| (۳۸) | طلسم ہفت پیکر، جلد سوم | ۱۸۹۷ | |
| (۳۹) | طلسم خیال سکندری، اول | ۱۹۰۰ | ۱۸۹۷؟ |
| (۴۰) | طلسم خیال سکندری، دوم | ۱۹۰۰ | ۱۸۹۷؟ |
| (۴۱) | طلسم خیال سکندری، سوم | ۱۹۰۰ | ۱۸۹۷؟ |
| (۴۲) | طلسم نوخیز جمشیدی، اول | ۱۹۰۱ | |
| (۴۳) | طلسم نوخیز جمشیدی، اول | ۱۹۰۱ | ۱۹۰۲ |
| (۴۴) | طلسم نوخیز جمشیدی، اول | ۱۹۰۱ | ۱۹۰۲ |
| (۴۵) | طلسم زعفران زار سلیمانی، اول | ۱۹۰۵ | |
| (۴۶) | طلسم زعفران زار سلیمانی، دوم | ۱۹۰۵ | |

☆☆☆☆

## جلدوں کی تعداد، باعتبار داستان گو

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، احمد حسین قمر، اور پھر شیخ تصدق حسین نے سب سے زیادہ جلدیں لکھیں۔ کئی جلدوں میں بعض دوسرے داستان گو بھی شریک تھے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ ہر داستان گو کی

داستانوں کی فہرست مرتب کر لی جائے۔ وھوہٰذا:

## احمد حسین قمر

انیس (۱۹) جلدیں

ہومان نامہ (۱)؛ طلسم ہوشربا (۴)؛ بقیۂ طلسم ہوشربا (۲)؛ طلسم فتنۂ نور افشاں (۳)؛ طلسم ہفت پیکر (۳)؛ طلسم خیال سکندری (۳)؛ طلسم نوخیز جمشیدی (۳) = ۱۹

## شیخ تصدق حسین

پندرہ (۱۵) جلدیں

نوشیرواں نامہ (۲)؛ ہرمز نامہ (۱)؛ کوچک باختر (۱)؛ بالا باختر (۱)؛ ایرج نامہ (۲)؛ آفتاب شجاعت (۶)؛ لعل نامہ (۲) = ۱۵

## محمد حسین جاہ

چار (۴) جلدیں

طلسم ہوشربا (۴) = ۴

## سید اسمٰعیل اثر

ایک (۱) جلد

صندلی نامہ = ۱

## پیارے مرزا اور شیخ تصدق حسین

ایک (۱) جلد

تورج نامہ، جلد اول (۱) = ۱

## احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور اسمٰعیل اثر

دو (۲) جلدیں

طلسم زعفران زار سلیمانی (۲) = ۲

## شیخ تصدق حسین، ''تصحیح'' از اسمٰعیل اثر

چار (۴) جلدیں

تورج نامہ، جلد دوم (۱)؛ گلستان باختر (۳) = ۴

میزان:

چھیالیس (۴۶) جلدیں

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ کہنا مشکل بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ''اعانت/استعانت'' اور ''تصحیح'' وغیرہ اصطلاحوں میں کیا فرق تھا؟ چونکہ یہ اصطلاحیں شیخ تصدق حسین کی بیان کردہ داستانوں ہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں، اس لئے گمان گذرتا ہے کہ شیخ تصدق حسین کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ وہ بینائی سے معذور تھے، یا حرف ناشناس تھے۔ دونوں صورتوں میں ایام کہنہ سالی میں انھیں کسی معاون کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اس معاون نے داستانوں کو ضبط تحریر میں لانے، یا شیخ تصدق حسین کے تیار کردہ مسودات کی درستی میں سید اسمٰعیل اثر یا پیارے مرزا نے جو بھی کام کیا اسے ارباب مطبع نے کہیں ''اعانت/استعانت'' کہا، اور کہیں ''تصحیح''، کہیں کچھ اور کہا۔ سر دست اس سے زیادہ کہنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کی پہلی جلد میں دیکھ چکے ہیں، ''آفتاب شجاعت'' کی تحریر، یا اس کا املا لینے میں آرزو لکھنوی کا بھی کچھ دخل رہا ہوگا، لیکن ان کا نام معاون یا مصحح کی حیثیت سے کہیں سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا۔

### ترتیب اشاعت

اب یہ بھی دیکھ لیں کہ تاریخ اشاعت کے اعتبار سے داستان کی جلدوں کی ترتیب کیا بنتی ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) ۱۸۸۳ طلسم ہوشربا، جلد اول

| | |
|---|---|
| (۲)۱۸۸۴ | طلسم ہوشربا، جلد دوم |
| (۳)۱۸۸۸/۱۸۸۹ | طلسم ہوشربا، جلد سوم |
| (۴)۱۸۹۰ | طلسم ہوشربا، جلد چہارم |
| (۵)۱۸۹۱ | طلسم ہوشربا، جلد پنجم، حصۂ اول |
| (۶)۱۸۹۱ | طلسم ہوشربا، جلد پنجم، حصۂ دوم |
| (۷)۱۸۹۲ | طلسم ہوشربا، جلد ششم |
| (۸)۱۸۹۳ | نوشیرواں نامہ، جلد اول |
| (۹)۱۸۹۳؟ | طلسم ہوش ربا، جلد ہفتم |
| (۱۰)۱۸۹۳ | ایرج نامہ، جلد اول |
| (۱۱)۱۸۹۳؟ | ایرج نامہ، جلد دوم |
| (۱۲)۱۸۹۳ | کوچک باختر |
| (۱۳)۱۸۹۵ | صندلی نامہ |
| (۱۴)۱۸۹۶ | تورج نامہ، جلد اول |
| (۱۵)۱۸۹۶ | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد اول |
| (۱۶)۱۸۹۶ | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد دوم |
| (۱۷)۱۸۹۶ | طلسم فتنۂ نور افشاں، جلد سوم |
| (۱۸)۱۸۹۶ | لعل نامہ، جلد اول |
| (۱۹)۱۸۹۷ | طلسم ہفت پیکر، جلد اول |
| (۲۰)۱۸۹۷ | طلسم ہفت پیکر، جلد دوم |
| (۲۱)۱۸۹۷ | طلسم ہفت پیکر، جلد سوم |
| (۲۲)۱۸۹۷ | بقیۂ طلسم ہوش ربا، جلد اول |
| (۲۳)۱۸۹۷ | بقیۂ طلسم ہوش ربا، جلد دوم |

(۲۴)۱۸۹۷؟ تورج نامہ، جلد دوم

(۲۵)۱۸۹۷ لعل نامہ، جلد دوم

(۲۶)۱۸۹۷؟ طلسم خیال سکندری، جلد اول

(۲۷)۱۸۹۷؟ طلسم خیال سکندری، جلد دوم

(۲۸)۱۸۹۷؟ طلسم خیال سکندری، جلد سوم

(۲۹)۱۸۹۸ نوشیرواں نامہ، جلد دوم

(۳۰)۱۸۹۹ بالا باختر

(۳۱)۱۹۰۰ ہرمز نامہ

(۳۲)۱۹۰۱ ہومان نامہ

(۳۳)۱۹۰۱ آفتاب شجاعت، جلد اول

(۳۴)۱۹۰۲ طلسم نوخیز جمشیدی، جلد اول

(۳۵)۱۹۰۲ طلسم نوخیز جمشیدی، جلد دوم

(۳۶)۱۹۰۲ طلسم نوخیز جمشیدی، جلد سوم

(۳۷)۱۹۰۳ آفتاب شجاعت، جلد دوم

(۳۸)۱۹۰۴ آفتاب شجاعت، جلد سوم

(۳۹)۱۹۰۵ آفتاب شجاعت، جلد چہارم

(۴۰)۱۹۰۵ طلسم زعفران زار سلیمانی، جلد اول

(۴۱)۱۹۰۵ طلسم زعفران زار سلیمانی، جلد دوم

(۴۲)۱۹۰۸ آفتاب شجاعت، جلد پنجم، حصۂ اول

(۴۳)۱۹۰۸ آفتاب شجاعت، جلد پنجم، حصۂ دوم

(۴۴)۱۹۰۹ گلستان باختر، جلد اول

(۴۵)۱۹۰۹ گلستان باختر، جلد دوم

(۴۶) 1917 گلستان باختر، جلد سوم

مندرجہ بالا نقشے سے یہ دلچسپ بات معلوم ہوتی ہے کہ "طلسم ہوشربا" کی غیر معمولی کامیابی نے ارباب مطبع کو ہمت دلائی کہ وہ دوسری داستانیں بھی شائع کریں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کی ساتوں جلدیں (یا آٹھوں، اگر جلد پنجم کے دو حصوں کو الگ الگ جلد مانا جائے، جو بالکل مناسب ہے) چھپ جانے کے بعد ہی "نوشیرواں نامہ"، جلد اول، چھپی (۱۸۹۳) اور اسی سال کئی اور جلدیں بھی منصۂ شہود پر آئیں۔ دوسری بات یہ بھی لائق توجہ ہے کہ محمد حسین جاہ نے "طلسم ہوش ربا" کی تیسری جلد لکھنے میں غالباً کئی سال لگائے (جلد دوم، ۱۸۸۴؛ جلد سوم، ۱۸۸۸ /۱۸۸۹)۔ میں نے "غالباً" اس لئے لکھا کہ ایک خفیف امکان ہے کہ جاہ نے جلد سوم کے لکھنے میں دیر نہ لگائی ہو، بلکہ ارباب پریس نے اس کے چھاپنے میں تعویق کی ہو۔ یہ بات قرین قیاس نہیں، لیکن بہر حال ممکن ضرور ہے۔ جاہ نے جلد سوم کے لکھنے میں دیر لگائی ہو، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ انھوں نے اس جلد میں ہی ذکر کیا ہے کہ اس جلد کی تحریر کا زمانہ ان کے لئے مصیبتوں اور بیماری کا زمانہ تھا۔ پھر نا قدری کا غم انھیں الگ تھا (جلد سوم، ص ص ۳۸۹، ۸۰۲، ۹۲۰)۔ جاہ نے جلد پنجم کو بہت جلدی کے باوجود ۱۸۹۰ میں ختم کیا، اور وہ بھی شاید سال کے اواخر کا زمانہ رہا ہوگا، کیونکہ یہ جلد دسمبر ۱۸۹۰ میں چھپی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس جلد میں داستان کچھ ادھوری سی معلوم ہوتی ہے۔

پوری داستان کی جلدوں کی اشاعت کا گراف بنائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اشاعتی سرگرمیوں کے اعتبار سے ۱۸۹۷ مصروف ترین سال تھا کہ اس سال دس نئی جلدیں شائع ہوئیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بعض قدیم جلدوں کی دوبارہ اشاعت بھی اس سال ہوئی ہو۔ ایک سال، یعنی ۱۸۹۴، بالکل خالی بھی گیا ہے۔ اس کی توجیہ فی الحال ممکن نہیں۔ بظاہر یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سال (اور بڑی حد تک ۱۸۹۵ بھی) تیاری اور بیج بونے کا سال رہا ہوگا۔ اس کے ثمرات ۱۸۹۶ سے ظاہر ہونا شروع ہوئے اور ۱۸۹۷ پوری شادابی اور بہار کا سال تھا:

۱۸۸۳ ایک جلد

| | |
|---|---|
| ۱۸۸۴ | ایک جلد |
| ۱۸۸۸ | ایک جلد |
| ۱۸۹۰ | ایک جلد |
| ۱۸۹۱ | دو جلدیں |
| ۱۸۹۲ | ایک جلد |
| ۱۸۹۳ | پانچ جلدیں |
| ۱۸۹۵ | ایک جلد |
| ۱۸۹۶ | پانچ جلدیں |
| ۱۸۹۷ | دس جلدیں |
| ۱۸۹۸ | ایک جلد |
| ۱۸۹۹ | ایک جلد |
| ۱۹۰۰ | ایک جلد |
| ۱۹۰۱ | دو جلدیں |
| ۱۹۰۲ | تین جلدیں |
| ۱۹۰۳ | دو جلدیں |
| ۱۹۰۴ | ایک جلد |
| ۱۹۰۵ | تین جلدیں |
| ۱۹۰۸ | دو جلدیں |
| ۱۹۰۹ | دو جلدیں |
| ۱۹۱۷ | ایک جلد |

ان اعداد سے بھی ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ محمد حسین جاہ کی رفتار تحریر غالباً بہت سست تھی اور احمد حسین قمر کی رفتار تحریر شاید بہت تیز تھی۔ شیخ تصدق حسین بھی خاصے زود نویس تھے، اور جن دنوں یہ دونوں حضرات پوری تندہی سے کام کر رہے تھے، وہی زمانہ داستان کی اشاعت کے سنہری برسوں میں گنا جائے گا۔ صرف پانچ سال (۱۸۹۳ تا ۱۸۹۷) کی مدت میں ان دو صاحبان نے اکیس جلدیں دنیا کے سامنے پیش کیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد کوئی بیس ہزار بیٹھتی ہے۔ اور تین سال (۱۸۹۳، ۱۸۹۶ اور ۱۸۹۷) اس قدر زرخیز تھے کہ ان تین برسوں میں بیس (۲۰) جلدیں شائع ہوئیں۔

داستان کی رفتار اشاعت میں پہلی کمی اس وقت آئی جب احمد حسین قمر کا انتقال ہوا (۱۹۰۱)۔ پھر بھی، شیخ تصدق حسین اور ان کے "ساتھیوں" نے ۱۹۰۱ سے لے کر ۱۹۰۹ کے درمیان چودہ جلدیں ہدیۂ ناظرین کیں۔ شیخ تصدق حسین کی موت (۱۹۰۹) کے بعد نول کشور پریس کو شاید کوئی داستان گو اپنے حسب معیار نہ ملا۔ لیکن ممکن ہے کہ نئی داستانیں شائع کرنے کا ارادہ اس لئے بھی سست پڑ گیا ہو کہ موجودہ داستانیں بے حد مقبول تھیں اور مزید داستانیں چھاپنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی ہو گی۔ اکثر جلدوں کے کئی ایڈیشن نکلے۔ "طلسم ہوش ربا" کی جلدیں تو ۱۹۴۰ تک چھپتی رہیں۔ ایک خفیف امکان یہ ہے کہ ۱۹۰۹ کے آس پاس داستانوں کی اشاعت کے بارے میں ارباب مطبع کی پالیسی کچھ بدل گئی ہو، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مطبع کے دفتر میں اب بھی کئی مسودات داستان بستوں میں بندھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر پالیسی یہ ہوتی کہ داستانیں حسب معمول چھپتی رہیں تو یہ اوراق یوں ہی مختصر اعتنا نہ رہ جاتے۔ لیکن بظاہر اس میں کوئی شک نہیں کہ داستان کی اشاعت کے ایام بہار بیسویں صدی کے آغاز میں رو بہ خزاں ہو چکے تھے۔

داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں میں سب سے زیادہ مقبولیت "طلسم ہوش ربا" کو حاصل ہوئی۔ لیکن کئی اور داستانیں بھی بار بار چھاپی گئیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، نول کشور پریس کی کتابوں میں "بار اول"، "بار دوم" وغیرہ کلمات کو لغوی معنی میں لینا درست نہیں، کیوں کہ ان کے حساب کا طریقہ ذرا پیچیدہ تھا۔ یہ اکثر ہوتا تھا کہ کوئی جلد لکھنؤ میں چھپ چکی ہو، لیکن جب وہ کانپور میں پہلی بار چھپتی تو اس پر "بار اول" لکھا جاتا۔ لکھنؤ میں بھی چھپی ہوئی کسی جلد کو دوبارہ چھاپا جاتا تو کبھی کبھی اس پر "بار

اول'' ہی لکھا رہنے دیا جاتا، کیونکہ پرانے ہی پتھروں کو بے ترمیم دوبارہ انطباع کے لئے کام میں لے آنا نول کشور پریس لکھنؤ میں عام دستور تھا۔ لہٰذا کسی جلد کی مقبولیت متعین کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کب تک چھپتی رہی۔ اگر کسی جلد کی کوئی اشاعت (مثلاً) ۱۹۲۰ تک کی ملتی ہے، اور کسی اور جلد کی (مثلاً) ۱۹۰۰ تک کی، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر زیادہ مقبول تھی، بشرطیکہ ۱۹۰۰ میں چھپنے والی جلد کے بارے میں ہمیں معلوم ہو کہ اس کی مجموعی اشاعتیں ۱۹۲۰ میں چھپنے والی جلد سے کم تھیں۔ نول کشور پریس کے تمام کاغذات ضائع ہو جانے، یا عام دسترس میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی بھی جلد کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا کہ وہ آخری بار کب چھپی۔ لیکن میرے پاس جو جلدیں ہیں، ان میں ایک سے زیادہ بار چھپنے والی جلدوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| ایرج نامہ، جلد دوم | تیسری اشاعت، جولائی ۱۹۱۳ |
| بالا باختر | دوسری اشاعت، کانپور، ۱۹۰۰ |
| بقیہ طلسم ہوش ربا، جلد اول | شمار اشاعت درج نہیں، مارچ ۱۹۱۱ |
| بقیہ طلسم ہوش ربا، جلد دوم | شمار اشاعت درج نہیں، ۱۹۱۱ |
| تورج نامہ، جلد اول | دوسری اشاعت، اپریل ۱۹۰۶ |
| تورج نامہ، جلد دوم | تیسری اشاعت، جون ۱۹۲۷ |
| صندلی نامہ | چوتھی اشاعت، ۱۹۲۷ |
| طلسم ہفت پیکر، جلد اول | تیسری اشاعت، فروری ۱۹۰۹ |
| طلسم ہفت پیکر، جلد دوم | دوسری اشاعت، اپریل ۱۹۱۵ |
| طلسم ہفت پیکر، جلد سوم | دوسری اشاعت، اگست ۱۹۱۳ |
| طلسم ہوش ربا، جلد اول | شمار اشاعت درج نہیں، ستمبر ۱۹۳۰ [غالباً پانچویں اشاعت]؛ چوتھی اشاعت، کانپور، مئی ۱۸۹۸ |
| طلسم ہوش ربا، جلد دوم | پانچویں اشاعت، جون ۱۹۳۲ |
| طلسم ہوش ربا، جلد سوم | شمار اشاعت درج نہیں، ۱۹۱۰ |

| | |
|---|---|
| طلسم ہوش ربا، جلد چہارم | شمار اشاعت درج نہیں، [غالباً چوتھی اشاعت] فروری ۱۹۲۷ |
| طلسم ہوش ربا، جلد پنجم، حصۂ اول | تیسری اشاعت، دسمبر ۱۹۳۰ |
| طلسم ہوش ربا، جلد پنجم، حصۂ دوم | چوتھی اشاعت، مارچ ۱۹۳۱ |
| طلسم ہوش ربا، جلد ششم | چھٹی اشاعت، مارچ ۱۹۴۰ |
| طلسم ہوشربا، جلد ہفتم | چوتھی اشاعت، فروری ۱۹۲۷ |
| کوچک باختر | تیسری اشاعت، دسمبر ۱۹۱۳ |
| لعل نامہ، جلد اول | دوسری اشاعت، جولائی ۱۹۱۳ |
| لعل نامہ، جلد دوم | دوسری اشاعت، اپریل ۱۹۱۷ |
| نوشیرواں نامہ، جلد اول | دوسری اشاعت، کانپور ۱۸۹۸؛ لکھنؤ، فروری ۱۹۰۳ |
| نوشیرواں نامہ، جلد دوم | تیسری اشاعت، اکتوبر ۱۹۱۵ |

''طلسم ہوش ربا'' کی کم سے کم ایک جلد ۱۹۴۰ میں بھی چھاپی گئی، اور ''طلسم ہوش ربا'' کو منہا کردیں تو داستان کی بقیہ جلدوں میں سے ''صندلی نامہ'' اور ''تورج نامہ''، دوم، ایسی جلدیں ہیں جو ۱۹۲۷ میں چھاپی گئیں۔ یعنی ان جلدوں کی مانگ اس وقت تک کچھ نہ کچھ برقرار تھی۔ ''صندلی نامہ'' اور ''تورج نامہ''، جلد دوم، کا عمومی انداز داستان گوئی کچھ بہت بلند نہیں، اور پھر بھی وہ ۱۹۲۷ میں ایک مزید اشاعت کی متحمل ہوسکیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ داستان گویوں میں یہ داستانیں عام سے زیادہ مقبول رہی ہوں گی۔ لیکن ایک نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ ممکن ہے بعض اور جلدیں بھی ۱۹۴۰ تک دوبارہ یا سہ بارہ (یا اور زیادہ بار) چھپی ہوں، لیکن وہ اشاعتیں میری دسترس میں نہیں ہیں۔

ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ''طلسم ہوش ربا''، جلد اول، کی اشاعت کانپور سے ۱۸۹۸ میں چوتھی بار ہوئی۔ ''نوشیرواں نامہ''، اول، کی دوسری اشاعت کانپور سے ۱۸۹۸ میں، اور لکھنؤ سے ۱۹۰۳ میں ہوئی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ''نوشیرواں نامہ''، اول، کی پہلی اشاعت (۱۸۹۳) کے دس سال کے اندر اس کی چار اشاعتیں نکلیں، اور یہ اس داستان کی بے حد مقبولیت کا ثبوت ہے، اس کے معنی یہ

بھی ہیں کہ ارباب مطبع کے یہاں کانپور کی اشاعتیں الگ شمار ہوتی تھیں۔ کانپوری اشاعتوں کا حساب پورا معلوم ہو جائے تو یہ اندازہ بہتر طور پر لگ سکے گا کہ کوئی جلد مجموعی طور پر کتنی بار چھپی۔ اس امکان سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ نول کشور پریس کی دوسری شاخیں (جیسے الٰہ آباد اور بھوپال) چاہے بہت دن تک اور بہت زیادہ فعال نہ رہی ہوں، لیکن ممکن ہے کہ داستان کی بعض جلدیں وہاں سے بھی اشاعت پذیر ہوئی ہوں، اور داستان کی جلدیں کسی نہ کسی پریس سے ۱۹۴۰، یا اس کے بھی بعد تک چھپتی رہی ہوں۔ لیکن چونکہ میرے پاس داستان کی جلدوں کا ذخیرہ خاصا وسیع ہے، اس لئے ہم اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ ۱۹۴۰ کے بعد کوئی اشاعت ہوئی ہوتی تو اس کا بھی ایک آدھ نسخہ اس ذخیرے میں ضرور ہوتا۔ اس بات کو، کہ میرے ذخیرے میں ۱۹۴۰ کے بعد کا کوئی نسخہ نہیں ہے، ایک طرح سے منفی ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ کے بعد داستان کی کوئی جلد شائع نہیں ہوئی۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ داستان امیر حمزہ (طویل) کی داستان اشاعت ۱۹۴۰ میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ بعض بعض برسوں میں داستان کا اشاعتی گوشوارۂ عمل بہت مصروفیت کا حامل ہے۔ اگر ہم یہ فرض نہ بھی کریں کہ ان مصروف برسوں میں کچھ پرانی جلدیں بھی دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی ہوں گی، تو بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ۱۸۹۳ سے ۱۸۹۷ کے درمیان اکیس نئی جلدیں منصۂ شہود پر آئیں۔ نول کشور پریس کے کاغذات موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ جلدوں کی تعداد اشاعت کیا ہوتی تھی۔ اغلب ہے کہ متوقع مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر جلد کی تعداد اشاعت سوچ سمجھ کر متعین کی جاتی ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی اشاعت کے بارے میں ایک بندھا ٹکا قاعدہ رہا ہو کہ (مثلاً پندرہ سو یا دو ہزار نسخے چھاپے جائیں گے)۔ داستان امیر حمزہ (مختصر) جس کے بیان کنندہ غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی ہیں، اس کا آخری ایڈیشن جو میرے پیش نظر ہے، وہ ۱۹۶۹ کا ہے اور اس پر تعداد اشاعت تین ہزار لکھی ہے۔ اگر یہ درست ہے (کیونکہ اصل تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے، کبھی کبھی کم کا بھی خفیف سا امکان ہے)، تو داستان (طویل) کی انفرادی جلدوں کی تعداد اشاعت انیسویں صدی کے اواخر میں پندرہ سو فی جلد سے کیا کم رہی ہوگی۔

فرینسس پریچیٹ (Frances Pritchett) نے اردو ہندی قصوں پر اپنی کتاب Marvellous Encounters میں بعض مشہور قصوں کی فہرست دی ہے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارے یہاں کتابی شکل میں اشاعت یاب ہوئے۔ انھوں نے پریس کا نام اور ہر قصے کی تعداد اشاعت بھی درج کی ہے۔ یہ فہرست انھوں نے متعلقہ ناشروں کے اصل کاغذات دیکھ کر مرتب کی ہے۔ ان کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو قصوں کی تعداد اشاعت ہندی قصوں کے مقابلے میں عموماً کم تھی۔ عام طور پر ان کی تعداد اشاعت ایک ہزار یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن اردو قصے بھی کبھی کبھی دو ہزار یا اس سے زیادہ چھپتے تھے۔ اس ضمن میں کچھ تفصیل اس کتاب کے باب اول میں درج ہے۔ اگر ان اعداد کو داستان کی جلدوں کی تعداد اشاعت کے لئے موٹے طور پر رہنما قرار دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ پندرہ سو کا شمار جو میں نے اوپر درج کیا، حقیقت سے بہت قریب ہونا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۹۳ سے ۱۸۹۷ کے زمانے میں منشی نول کشور نے داستان کی اکیس جلدوں کے کم سے کم ۲۱×۱۵۰۰ یعنی ۳۱۵۰۰ نسخے بازار میں عام کیے۔ میں نے ''بازار میں عام کیے'' اس لئے کہا ہے کہ یہ نسخے بہت جلد جلد فروخت ہوتے ہوں گے، ورنہ انھیں محفوظ رکھنے کے لئے اور اس طرح مرتب رکھنے کے لئے، کہ وہ آسانی سے ہاتھ آسکیں، بہت بڑی جگہ درکار ہوتی اور منشی نول کشور مرحوم اپنی تمام وسعت مکان اور فراخی مقام کے باوجود اتنی بڑی جگہ کا انتظام نہ کر سکتے ہوں گے۔ مکرر اشاعت یافتہ جلدوں کی فہرست میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں نئی جلدیں چھپ رہی تھیں وہاں پرانی جلدوں کی مزید اشاعت بھی اسی زمانے میں ہو رہی تھی۔

ہم لوگوں کو عام طور اس بات کا خیال نہیں آتا کہ کاغذ بہت بھاری ہوتا ہے، چھپ کر اور جلد بندھ کر وہ اور بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال کم ہی آتا ہے کہ اگر کاغذ کو صحیح جگہ اور صحیح طرح نہ رکھا جائے تو آتش زدگی کے بھی خوف سے زیادہ اس کے بہت جلد خراب ہو جانے، بلکہ گل سڑ جانے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ کتاب کو کاغذ یا لکڑی کے گٹھے یا اینٹوں کے چٹے کی طرح ایک پر ایک لاد کر نہیں رکھ سکتے، خاص کر اگر کتاب کے بارے میں توقع ہو کہ اس کی مانگ روز ہی آئے گی اور وہ جلد فروخت ہو جائے گی۔ ایسی کتابوں کو الماریوں میں قطار کی صورت رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی

دھیان میں رکھئے کہ نول کشور پریس سے صرف داستانیں نہیں شائع ہو رہی تھیں۔ وہاں سے عربی، فارسی، سنسکرت کی ضخیم کتب، اور ان کی طویل فہرستیں، اور ایک اخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ پریس میں کاغذ کی اتنی کھپت تھی کہ منشی صاحب نے بالآخر اپنے لئے کاغذ کا کارخانہ ہی کھول لیا۔ ان باتوں کو لحاظ میں رکھیں تو میری یہ بات زیادہ وثوق انگیز معلوم ہوگی کہ نول کشور پریس نے پانچ سال سے کم کی مدت میں داستان کی مختلف جلدوں کے کم از کم ۲۱۵۰۰ نسخے بازار میں عام کئے۔

اس کا قطعی امکان ہے کہ تعداد اشاعت کا جو تخمینہ میں نے اوپر درج کیا ہے وہ اصل سے بہت کم، یا کچھ کم ہو۔ اس معاملے میں ایک خفیف سا سراغ داستان کی انفرادی جلدوں کی قیمتوں سے بھی لگ سکتا ہے۔ اگر ہم ۱۹۱۱ کی تفصیلی فہرست کو (جس کا ذکر اس کتاب کے باب دوم میں آچکا ہے) مجموعی طور پر پورے اشاعتی کام کا نمائندہ نمونہ خیال کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک جلد کی اوسط قیمت تین روپے تھی۔ اس زمانے کی قیمتوں اور روپے کی قوت خرید کو دیکھتے ہوئے یہ قیمت کسی طرح کم، یا معمولی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے اواخر کے ایک روپے کو آج کے سو (۱۰۰) سے لے کر سوا سو (۱۲۵) روپے کے برابر فرض کر سکتے ہیں۔ لہٰذا داستان کی جلدوں کی قیمتیں خاصی سخت تھیں اور اعلیٰ متوسط طبقے (Upper Middle Class) کے لوگوں سے نیچے کے افراد یا گھرانے داستان کی جلدیں خریدنے کے متحمل بمشکل ہی ہو سکتے ہوں گے۔ اس کے باوجود داستان بہت اچھی تعداد میں فروخت ہوتی ہوگی، کیونکہ اکثر جلدوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ لیکن قیمتوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ ایک اور طرح سے بھی نکل سکتا ہے۔

''نوشیرواں نامہ''، جلد اول کی پہلی اشاعت (۱۸۹۳) میں ''طلسم ہوش ربا'' کا جو اشتہار درج ہے اس کے اعتبار سے ''ہوش ربا'' کی انفرادی جلدیں حسب ذیل قیمتوں پر دستیاب تھیں:

| | |
|---|---|
| جلد اول | ڈھائی روپے |
| جلد دوم | ڈھائی روپے |
| جلد سوم | ڈھائی روپے |
| جلد چہارم | تین روپے |

| | |
|---|---|
| جلد پنجم | ساڑھے چار روپے |
| جلد ششم | ساڑھے تین روپے |
| جلد ہفتم | تین روپے |
| میزان | ساڑھے اکیس روپے |

یہ گوشوارہ دلچسپ تو ہے ہی، دلچسپ تر بات یہ ہے کہ مطبع نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ ساتوں جلدیں یکجا خریدنے پر قیمت میں ڈیڑھ روپے کی کر کے صرف بیس روپے طلب کئے جائیں گے۔ اس سے حسب ذیل نتائج نکل سکتے ہیں:

(۱) ارباب مطبع کی نظر میں ڈیڑھ روپے کی چھوٹ خاصی معتد بہ رقم کی چھوٹ تھی۔

(۲) خریداروں کے لئے بھی یہ رقم اچھی باوزن رقم تھی، کہ اس رعایت کی خاطر وہ یک مشت بیس روپے خرچ کرنے کو تیار ہو سکتے تھے۔

(۳) کاروباری اعتبار سے یہ جلدیں کامیاب قرار دی جاتی ہوں گی، یعنی ان کی رفتار فروخت اچھی ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ارباب مطبع کچھ زیادہ رعایت کا اہتمام کرتے۔ (آج کل تو پچاس فی صدی تک بھی رعایت مہیا ہو جاتی ہے، لیکن کتابوں کی قیمتیں انیسویں صدی کے اواخر کے مقابلے میں اب بھی بہت کم ہیں۔)

یہ بات بھی ملحوظ رکھئے کہ داستان امیر حمزہ (طویل) اس زمانے میں واحد داستان نہیں تھی جو منشی نول کشور کی توجہ اور سعی سے صفحۂ قرطاس پر آ کر حلیۂ طبع سے آراستہ ہو رہی تھی۔ داستان (مختصر) کی اشاعت بھی اسی زمانے میں جاری تھی۔ محمد حسین جاہ کی یک جلدی داستان "طلسم فصاحت" پہلی بار ۱۸۷۴ میں چھپی تھی اور بعض جگہ انتہائی ادق عبارت کے باوجود اس قدر مقبول تھی کہ ۱۸۹۲ تک کم سے کم چار بار چھپ چکی تھی۔ احمد حسین قمر کی داستان "طلسم نارنج" کی اشاعت ۱۹۰۱ میں ہوئی۔ اگرچہ یہ بظاہر دوبارہ نہیں چھپی، لیکن اس کی اول اشاعت نے گودام میں بہر حال کئی سو نسخوں کا اضافہ کیا ہو گا۔ پھر نول کشور پریس نے اور بھی داستانیں چھاپی تھیں۔ نثری داستان (یک جلدی) تو چھپتی ہی رہتی تھی، اس کا منظوم روپ "طلسم شایاں" جس کے مصنف طوطا رام شایاں تھے، اور جس میں کوئی سولہ ہزار

شعر ہیں، پہلی بار ۱۸۸۲ میں چھپی، اور آئندہ بھی طبع ہوتی رہی۔

ان باتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ داستان (طویل) کی جلدیں جلد جلد فروخت ہو جاتی ہوں گی۔ اور یہ بات، کہ "طلسم ہوش ربا" کی کم از کم ایک جلد ۱۹۴۰ تک چھاپی جا رہی تھی، داستان کی سخت جانی کے بھی ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ کئی طرح کے متبادل بیانیوں، پارسی تھیٹر، اور فلم، اور ان سب سے بڑھ کر عمومی ادبی تہذیبی فضا میں داستان مخالف تصورات کی مقبولیت، اور داستان کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیوں کے عام ہوتے ہوئے بھی داستان نے بہت دیر تک اپنی زندگی کچھ نہ کچھ باقی رکھی۔ یہ بڑی بات ہے۔ اور یہ بات ذرا تعجب انگیز بھی ہے کہ داستان کی مقبولیت میں تخفیف اس تیزی سے آئی، اور ادبی تہذیبی فضا اس شدت اور وسعت سے اس کے خلاف ہوئی کہ اردو ادب کے عام پڑھنے والے کے لئے داستان (طویل) معدوم ہو گئی۔ اس کا حال بالکل ہندوستانی شام کا سا ہوا، کہ ابھی اچھی خاصی روشنی ہے، اور ابھی اچھا خاصا اندھیرا، اور تھوڑی دیر میں پوری رات۔

سچ پوچھئے تو داستان کے خلاف جن عناصر نے سب سے زیادہ کام کیا وہ ہمارے تہذیبی اور ادبی تصورات میں تغیر، بلکہ انقلابی تغیر، تھا۔ داستان میں وہ تمام ادبی عیب فرض کر لئے گئے جن کی اصلاح ہمارے خیال میں ناول کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ اخلاقی سطح پر داستان کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ تمام و کمال نہیں، تو اس کا بڑا حصہ بہو بیٹیوں کے پڑھنے یا سننے کی چیز نہیں۔ محمد حسن عسکری نے جب ۱۹۵۵ میں "انتخاب طلسم ہوش ربا" شائع کیا تو کچھ امکان پیدا ہوا کہ اردو کا "سرکاری" معاشرہ، یعنی کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور محدود ہی طور پر سہی، لیکن داستان میں دلچسپی کا احیا ہو۔ چنانچہ عسکری صاحب کا انتخاب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں رکھا گیا۔ لیکن عسکری صاحب نے تصویریں اس میں حنیف رامے (۱) سے بنوائی تھیں اور وہ تصویریں ارباب اقتدار کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہریں۔ لہٰذا کتاب کو نصاب سے باہر کر دیا گیا۔ ایک طرح سے دیکھیں تو ۱۹۵۵ کو داستان کی داستان اشاعت کی آخری اہم تاریخ کہا جا سکتا ہے ☆☆

---

(۱) افسوس کہ چند ماہ ہوئے حنیف رامے بھی راہی ملک عدم ہوئے۔

## باب پنجم

# ذکر داستان گویاں

اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اس بات کا رونا رو چکے ہیں کہ ہمیں داستان امیر حمزہ کے داستان گویوں، بلکہ یوں کہیں کہ عمومی طور پر کسی بھی داستان گو کے بارے میں، معلومات بہت کم ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات، ان کی تعلیم و تربیت، تاہل و اولاد، ان سب باتوں کے بارے میں ہمارا علم بہت کم ہے۔ اور مزید افسوس یہ کہ ان معاملات میں جو علم ہم رکھتے بھی ہیں، وہ اکثر غلط، یا بڑی حد تک نا معتبر ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی معلوم ہے اس کا بیان اور حتی الامکان تنقیدی محاکمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

## محمد حسین جاہ (وفات، بعد از ۱۸۹۱ و قبل از ۱۸۹۳)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کی مشہور ترین داستان ''طلسم ہوش ربا'' ہے، اور ''طلسم ہوش ربا'' کی بہترین جلدیں وہ چار جلدیں ہیں جو محمد حسین جاہ نے لکھیں۔ انھوں نے نول کشور پریس کو چھوڑنے کے بعد ''طلسم ہوش ربا'' کی ایک پانچویں جلد بھی لکھی اور وہ بقول خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی، گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور کی شاخ لکھنؤ نے ''جلد پنجم، حصۂ اول'' کے نام سے دسمبر ۱۸۹۰ میں شائع کی۔ لیکن اسے کچھ خاص شہرت نہ حاصل ہوئی۔ محمد حسین جاہ کے بارے میں یہی آخری اطلاع ہے۔ جاہ کی یہ جلد پنجم بہت مختصر (صرف ۲۴۰ صفحے) ہے، اور یہ تقریباً نا پید تھی۔ جناب رفاقت علی شاہد نے اسے دریافت کیا اور اس کی نقل از راہ لطف مجھے بھی فراہم کی۔ خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ نے اسے میری درخواست پر ۲۰۰۰ء میں شائع کر کے عام کر دیا۔ جناب رفاقت علی شاہد اور خدا بخش لائبریری (بالخصوص اس وقت کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمن چغانی) ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

رفاقت علی شاہد نے جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کے خدا بخش ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۸۹۰ میں شاخ گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہوری کی کوئی شاخ لکھنؤ میں نہ تھی، لیکن اس مطبع کی شاخ بقول رفاقت علی شاہد، لکھنؤ میں ۱۸۹۵ میں ضرور قائم تھی۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ جاہ کی جلد پنجم کو گلاب سنگھ نے چھاپا ہو۔ خود اس جلد میں التماس مصنف کے عنوان سے جاہ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ''بعد ترک روزگار ہو جانے کے'' اپنا مطبع قائم کیا ہے۔ خود اس جلد کے حقوق مالکانہ بھی حسینی پریس، لکھنؤ کے نام محفوظ بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ ثابت ہے کہ نول کشور پریس چھوڑ کر جاہ نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ لیکن ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم کے بعد کچھ اور شائع نہ ہونے کے معنی یہ نکل سکتے ہیں کہ مطبع کا کاروبار سرسبز نہ ہوا اور جاہ نے اپنے باقی دن داستان گوئی، یا بیکاری میں گذارے۔ اور پھر دو ہی تین برس کے اندر وہ رہگرائے عالم باقی بھی ہو گئے۔

رفاقت علی شاہد کا خیال ہے کہ ''سید محمد اسمٰعیل''، جن کے اور جاہ کے مشترک اہتمام میں جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم چھپی تھی، وہی مشہور داستان گو (سید محمد اسمٰعیل اثر) ہیں جن کی داستان ''صندلی نامہ'' سے ہم واقف ہیں۔ لیکن سید محمد اسمٰعیل اثر اپنا تخلص ہمیشہ استعمال کرتے تھے، اور یہاں تخلص ندارد ہے، صرف ''سید محمد اسمٰعیل'' ہے۔ دوسری بات یہ کہ داستان طویل کی جلدوں میں اکثر ان کا ذکر ''مولوی'' کے لقب کے ساتھ ہوا ہے، اور یہاں ''مولوی'' بھی ندارد ہے۔ لہٰذا ان سید محمد اسمٰعیل اور مولوی سید محمد اسمٰعیل اثر داستان گو کا ایک ہی شخص ہونا بہت زیادہ قرین قیاس نہیں۔ ممکن ہے یہ سید محمد اسمٰعیل صاحب کوئی مالی ساجھے دار رہے ہوں اور جاہ سے ان کا تعلق صرف کاروباری رہا ہو۔

محمد حسین جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' کی جلد چہارم بھی نول کشور پریس نے دسمبر ۱۸۹۰ میں شائع کی تھی۔ محمد حسین جاہ نے نول کشور پریس کیوں چھوڑا، اس کے بارے میں کوئی مصدقہ معلومات نہیں۔ ایک خیال سا ہے کہ معاوضے کی بات پر کچھ اختلاف رائے تھا اور جاہ نے ناخوش ہو کر نول کشور پریس چھوڑ دیا (بروایت خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی)۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سے زیادہ بڑی وجہ یہ تھی کہ جاہ بہت سست نویس تھے۔ جلد سوم میں انھوں نے بیماری، بیٹے اور بیٹی کی موت، وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر انھیں یہ جلد لکھنے میں بڑی مشکل اور تاخیر ہوئی۔ جلد چہارم میں عجلت تحریر کے آثار

کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور اس کا اختتام بھی کچھ بے ربط سا ہے۔ ممکن ہے جاہ نے ارباب مطبع کے ابرام سے گھبرا کر چوتھی جلد جوں توں لکھ کر جمع کر دی اور مطبع سے تعلق توڑ لیا۔ (یا خود مالک مطبع نے انھیں ملازمت سے الگ کر دیا، یا یوں کہیں کہ ان کی خدمات کو مزید حاصل کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ حسینی پریس والی جلد پنجم کے اختصار کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ست نویسی کے الزام سے خود کو بری رکھنے کی فکر میں انھوں نے جلد جلد جو ممکن ہو سکا جمع کر کے اسے "جلد پنجم، حصۂ اول" کا نام دے دیا۔ لیکن شاید اس کے بعد وہ کچھ لکھ نہ پائے۔ رفاقت علی شاہد بھی اسی خیال کے ہیں کہ نول کشور پریس اور جاہ میں علیحدگی کی بنا جاہ کی دیر نویسی تھی۔

ایک امکان یہ ہے کہ جاہ اور مطبع کے مراسم بگڑ جانے میں جاہ کے مزاج کو بھی کچھ دخل رہا ہے۔ احمد حسین قمر میں خود بینی بہت تھی، وہ دوسروں (خاص کر جاہ) پر چھینٹے بھی خوب اڑاتے ہیں، اپنی توصیف بھی بے دریغ لکھتے ہیں اور بے دھڑک ڈینگیں ہانکتے ہیں۔ شیخ تصدق حسین بمشکل ہی کسی کی برائی یا اپنی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں صاحبان ارباب مطبع کی ثنا خوانی میں ہمہ وقت رطب اللسان بھی رہتے ہیں۔ محمد حسین جاہ میں خودنگری تو نہیں لیکن خودداری بہت تھی۔ محمد حسین جاہ کسی کی برائی نہیں کرتے، ڈینگیں نہیں مارتے۔ لیکن عام داستان گویوں کے برخلاف، انھوں نے ارباب مطبع (منشی نول کشور، یا دوسرے اہم اہل کاران) کی ثنا و توصیف بھی بہت کم لکھی ہے۔ اکثر انھوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر منشی نول کشور نے انھیں داستان نویسی پر مامور کیا ہے تو گویا ان کی قدر دانی ہی کی ہے، کچھ خاص نوال و کرم گستری نہیں کی۔ "طلسم ہوش ربا"، جلد سوم میں ایک مقام کے سوا (جس کا ذکر آگے آتا ہے) جاہ نے منشی نول کشور یا صاحبان مطبع کی مدح کہیں نہیں لکھی ہے۔

"طلسم فصاحت" (اول اشاعت ۱۸۷۴) میں البتہ محمد حسین جاہ نے منشی نول کشور کی مدح میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن وہ زمانہ ان کی جوانی کا رہا ہوگا۔ نئی نئی ملازمت تھی یا نئے نئے مراسم تھے، لہٰذا حق وفاداری ادا کرنا ہی تھا۔ مگر انھوں نے اس داستان میں مطبع کے دوسرے اہم اہل کاروں کی بھی مدح لکھی ہے، یعنی اشارہ کیا ہے کہ منشی نول کشور کے علاوہ بھی کئی لوگ مستحق تشکر و تمدح ہیں۔ اور شاید یہ بھی ہے کہ دنیاداری کا بھی تقاضا تھا کہ سردار و سرکار کے علاوہ ملازمین سرکار کو بھی نظر میں رکھا جائے۔ کارکنان مطبع

میں سے حسب ذیل حضرات کی توصیف محمد حسین جاہ نے "طلسم فصاحت" میں کی ہے: میرزا عاشق علی، نقاش وخوش نویس؛ میر حشمت علی، نقاش؛ شیخ احمد حسین بن شیخ امیر علی، مصور ونقاش؛ مصحح صاحبان (نام نہیں لکھا)؛ محرر صاحبان (نام نہیں لکھا)؛ ایڈیٹر اودھ اخبار (نام نہیں لکھا)؛ لالہ کنول، خزانچی۔

یہ خیال بعید از قیاس نہ ہوگا کہ محمد حسین جاہ اتنے بہت سے کارکنان مطبع کے ستائش گر اس باعث بھی ہوئے ہوں گے کہ اس طرح وہ منشی نول کشور کو بالواسطہ یہ اشارہ دینا چاہتے ہوں کہ ان کے رفیع الشان کاروبار مملکت کا بلند مرتبہ صرف منشی صاحب ہی کا مرہون منت نہیں۔ بہر حال، یہ بات تو ظاہر ہی ہو جاتی ہے کہ جاہ کے مزاج میں ایک طرح کی وارستگی اور خودداری تھی اور وہ منشی صاحب کو بلا شرکت غیرے اپنے شکریے کا حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ اور منشی نول کشور سے تعلقات بگڑنے میں اس بات کو بھی کچھ دخل ضرور رہا ہوگا۔ بہر حال، اگر جاہ کی زندگی کی پہلی اہم تاریخ جو ہمیں معلوم ہے، ۱۸۷۴ ہے (جب "طلسم فصاحت" نول کشور پریس سے شائع ہوئی) تو دوسری اہم تاریخ ہم جس سے واقف ہیں، ۱۸۹۰ ہے۔ اس سال ان کی "طلسم ہوش ربا"، جلد چہارم، نول کشور پریس سے چھپی، اور اسی سال کے دسمبر میں ان کی طلسم ہوشربا"، جلد پنجم کی مختصر سی جلد حسینی پریس سے چھپی۔ اسی سال مطبع نول کشور سے ان کا تعلق منقطع ہوا۔

اپنی جلد پنجم، حصہ اول، (مطبوعہ حسینی پریس، لکھنؤ) کے اختتامیہ میں جاہ نے لکھا ہے کہ "اور دفاتر مثل نوشیرواں نامہ وایرج نامہ وغیرہ بموجب اپنے طرز کے ترجمہ کر کے طبع کروں گا" (ص ۲۴۰)۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، جاہ نے اس کے بعد کچھ نہ لکھا۔ یا اگر لکھا بھی تو ہمارے سامنے آیا نہیں ہے۔ اس کا امکان ہے کہ ان کی "ہوش ربا"، جلد پنجم، حصہ اول، کو کچھ خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو، اور جاہ نے بددل ہو کر اشاعت داستان کا کام روک دیا ہو، اور صرف داستان گوئی پر اکتفا کر لی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی زندگی کے آخری ایک یا دو برس جو باقی تھے وہ عسرت اور/یا بیماری میں گذرے ہوں اور انھوں نے داستان گوئی بھی چھوڑ دی ہو۔ لیکن یہ بھی امکان ہے کہ انھوں نے داستان گوئی چھوڑی تو نثاری یا نثر خوانی اختیار کر لی ہو۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

"طلسم ہوشربا"، جلد سوم، میں جاہ نے بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے ان کے حالات پر

حالات پر کچھ دھندلی روشنی پڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ ''ناقدری'' کی شکایت کرتے ہیں، اور یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ اب شاید وہ داستان نویسی نہ کریں۔ نول کشور پریس، کانپور کی اشاعت ۱۹۱۰، صفحہ ۸۰۲ پر داستان کے ایک نئے موڑ پر وہ ساقی نامہ لکھتے ہیں اور متکلم کی زبان سے خودکو مخاطب کرتے ہیں۔

افسانے کے ناظرین ذیشان
ذی فہم و ہنرور و سخندان
گر دیکھتے مہر کی نظر سے
اس ذرے کو آفتاب کرتے
اس وقت تھا فخر تجھ کو زیبا
لیکن مطلب میں تیرا سمجھا
بر خاستہ دل ہوا ہے تیرا
ہے قول سے تیرے رنج پیدا
یہ تیسری جلد ختم کر کے
شاید کہ قلم نہ تو اٹھائے
پیدا نہیں جب کہ قدرداں ہے
محنت بے سود رایگاں ہے

بظاہر یہ شکوۂ ناقدری ارباب مطبع سے ہے، کہ شاید وہ جاہ کو خاطرخواہ معاوضہ نہ دیتے رہے ہوں۔ اور ان کا یہ کہنا کہ شاید اب وہ آگے نہ لکھیں، ایک طرح کی دھمکی، یا بہتر سودا پٹ جانے کی درخواست تھی۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ بیٹے بیٹی کی موت اور خود اپنی بیماری نے انھیں دل شکستہ بھی کردیا تھا۔ اسی جلد کے صفحہ ۳۸۹ تا ۳۹۱ پر وہ کہہ چکے ہیں۔

شب تار و تاریکی رنج و غم
بلاؤں کا تھا سامنا دم بدم

زیادہ اندھیرے کا یہ تھا سبب
کہ گھر بے چراغ ہو گیا ہے بیاب
اندھیرا نہ کیوں آئے مجھ کو نظر
جو کھوئے گئے دو ہوں نور نظر

☆☆

کبھی دل کو رویا جگر کو کبھی
کبھی دخترک کو پسر کو کبھی
مری بعد فرزند دختر مری
اکیلا مجھے آہ وہ کر گئی

☆☆

تھے القصہ روشن مرے دل کے داغ
نہ اختر فلک پر نہ گھر میں چراغ
نہ تھا کوئی اس شب کو میرا انیس
غم و رنج دونوں کا تھا بس جلیس
یکا یک ہوئی اک طرف روشنی
چمک مثل مہتاب پیدا ہوئی
جو دیکھا تو ہے شاہد خوش جمال
بھویں جس کی دونوں ہیں رشک ہلال

☆☆

اسی کے یہ تھی حسن کی بس ضیا
غرض وہ قریب آ کے کہنے لگا
کہ اے جاہ جانے دو یہ رنج و غم

مئے جام عشرت پیو دم بدم

☆☆

تو گویا ہوا مجھ سے وہ مہ لقا

کہ میں فیض ہوں تیرے ممدوح کا

☆☆

نہیں جانتا اس کو اے خوش مقال

وہ ہے مرتبہ دان اہل کمال

نکل جائیں گے صاف قسمت کے بل

ہر اک ہے مہم اس کے ایما سے حل

ہے ظل ہما جس کا ظل کرم

وہ نام نول اور کشور بہم

پیو جام مے داد عشرت کی دو

بنام مبارک فسانہ لکھو

معلوم ہوتا ہے کہ جاہ کو اولاد کا غم باقی رہا لیکن اپنے ممدوح و مربی سے جو توقعات انھیں تھیں وہ بھی پوری نہ ہوئیں۔ اسی جلد سوم کے اختتام کے قریب (ص ۹۲۰) جاہ لکھتے ہیں:

بڑے انتشار و پریشانی میں اس جلد کو میں نے لکھا ہے۔ اولاد کا غم دل کو رہا ہے، بہت عرصہ تک خود علیل رہا، ضعف دل و دماغ رہا...فی الجملہ حضرات سخن سنج داد دیں گے اور مجھ کو بہ نیکی یاد کریں گے۔ اور میں، خدا چاہے گا تو آئندہ قصہ بیان کرنے کی نسبت بذریعۂ اشتہار اطلاع دوں گا۔

یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جاہ نے داستان گویوں کے طریقے کے برعکس، یہاں اپنے مربی کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ان کی عنایت ہوئی اور تقاضا ہوا تو اور لکھوں گا۔ اس کے برخلاف وہ لکھتے ہیں کہ آئندہ قصے کے ''بیان کرنے'' کی ''اطلاع بذریعۂ اشتہار'' دی جائے گی۔ یعنی ''طلسم ہوش ربا''، جلد

سوم، کی تحریر ختم ہوتے ہوتے انھوں نے یا تو یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب داستان لکھیں گے ہی نہیں، صرف زبانی بیان کریں گے، یا پھر ان کا ارادہ تھا کہ پریس کی نوکری چھوڑ کر اب وہ اپنا کاروبار شروع کریں گے۔ پہلا مفروضہ زیادہ قابل وثوق ہے، کیونکہ بہر حال محمد حسین جاہ نے ''طلسم ہوش ربا''، جلد چہارم لکھی اور مطبع نے اسے چھاپا۔ اس کا مطلب یہ نکل سکتا ہے کہ زبانی داستان سرائی کا ان کا ارادہ پورا نہ ہو سکا، لہٰذا انھوں نے نوکری نہیں چھوڑی۔ مربی کی فرمائش، یا حکم، یا موجودہ اور متوقع کرم نمائیوں کا ذکر (جو احمد حسین قمر اور شیخ تصدق حسین کے یہاں بار بار ملتا ہے) محمد حسین جاہ کے یہاں کہیں نہیں ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم کے اختتام (ص ۹۵۶) پر وہ لکھتے ہیں کہ داستان سرائی سے میرا مقصد صرف ''شوکت دین حق'' ظاہر کرنا ہے۔ ہر جلد کے آخر میں وہ کچھ اختتامیہ جملے ضرور لکھتے ہیں جن سے اختتام جلد اور واقعات آئندہ کی کچھ خبر ملتی ہے۔ اس کے برخلاف، ''طلسم ہوش ربا''، جلد چہارم بالکل اچانک ختم ہوتی ہے (۱۹۱۳ کا ایڈیشن [کانپوری] اس وقت میرے سامنے ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۲۷۹):

> ایک مرد صاحب کمال جن داڑھی تا بہ ناف ہے اور پلکیں بڑھ کر رخسار پر پڑی تھیں، عبا گلے میں پہنے عمامہ سر پر باندھے صحیفۂ ابراہیمی کی تلاوت کر رہے ہیں۔ لقا کے پاؤں کی آہٹ پا کے انھوں نے سر اٹھایا اور کہا، ''او لقا تو یہاں کیوں آیا، جا یہاں سے!''
> لقا بھی اس کو مرد خدا پرست سمجھ کر تخت پر سوار ہو کر اپنے لشکر میں آیا۔

عبارت کی بے ربطی اور بیانیہ کی غیر اختتام پذیری صاف ظاہر ہے، اور اس سے بھی زیادہ یہ بات ظاہر ہے کہ مسودہ شاید نامکمل ہی حالت میں جاہ کے ہاتھوں سے لے لیا گیا، یا خود انھوں نے ارباب مطبع کے شبانہ روز تقاضوں سے تنگ آکر انھیں دے دیا۔ اول الذکر امکان زیادہ قرین قیاس ہے، کیوں کہ اگر جاہ خود سے مسودہ داخل پریس کرتے تو کچھ اختتامی عبارت تو لکھتے، یا آئندہ جلد کی خبر دیتے۔ ان سب باتوں کی عدم موجودگی، اور عبارت کی بے ربطی کم و بیش ثابت کر دیتی ہے کہ پریس اور جاہ کے تعلقات اب ختم ہو رہے ہیں یا ختم ہو چکے ہیں، اور تجدید تعلقات کا امکان معدوم نہیں تو بہت دھندلا ضرور ہے۔

☆☆☆
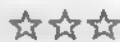
اس بات کا امکان ہے کہ عمر کے لحاظ سے احمد حسین قمر نے محمد حسین جاہ سے زیادہ عمر پائی۔ یہ تو

یقینی ہے کہ ان دونوں میں قمر زیادہ معمر تھے۔ جاہ کو "طلسم ہوش ربا"، جلد پنجم، حصۂ اول، اور حصۂ دوم کی دوسری اشاعت (دونوں کی تاریخ اشاعت ۱۸۹۳) کے بالترتیب صفحہ ۸۳۸ اور صفحہ ۸۸۷ پر "مرحوم" لکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۹۲ میں، یا اس کے آس پاس ہوا ہوگا، لیکن ان کی تاریخ پیدائش، یا تعلیم و تربیت وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ جاہ کے اصل وطن کے بارے میں بھی ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ اغلب ہے کہ وہ لکھنؤ ہی کے رہے ہوں۔ "طلسم فصاحت" (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۸۱) کے صفحہ ۷ پر انھوں نے خود کو "سید محمد حسین ابن سید غلام حسین رمال ساکن لکھنؤ تخلص جاہ" لکھا ہے۔ "ساکن" سے تو وطن بھی مراد ہو سکتی ہے اور مستقل قیام بھی۔ چونکہ انھوں نے اپنے والد کو "رمال" بیان کیا ہے تو گمان گذرتا ہے کہ یہ لوگ لکھنؤ کے اصل باشندے، یا وہاں مدت سے قیام پذیر ضرور رہے ہوں گے، کہ رمالوں کے مربیوں، یا رمالوں سے استفادہ کرنے کے جویا حضرات کی تعداد شہروں میں عموماً زیادہ ہوتی ہے۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ جہاں ہمیں جاہ کی پیدائش اور اوائل عمر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، وہاں ان کے "استادوں" کے بارے میں ہمیں طرح طرح کی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً گیان چند نے لکھا ہے (صفحہ ۲۹ے) کہ وہ "بڑے منشی فدا علی کے شاگرد تھے اور 'چھوٹے منشی' کے نام سے مشہور تھے۔" گیان چند نے کوئی سند نہیں دی ہے، لیکن ان کا بیان غالباً خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مضمون "لکھنؤ کی داستان گوئی" سے ماخوذ ہے۔ آگے چل کر صفحہ ۳۱ے پر گیان چند نے آغا جانی کاشمیری کی خودنوشت "سحر ہونے تک" کا ایک اقتباس دیا ہے جس میں جاہ کو قمر کا چھوٹا بھائی بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دونوں صاحبان "سیکڑوں آدمیوں" کے مجمعے میں داستان سناتے تھے اور منشی نول کشور کے کاتب انھیں لکھتے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ آغا جانی کاشمیری کے یہ سب بیانات محل نظر ہیں۔ لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت اور ان کے حوالے سے گیان چند کا یہ قول سراسر بے بنیاد نہیں کہ جاہ کے استاد میر فدا علی تھے۔ فرق یہ ہے کہ میر فدا علی نے جاہ کو نثر خوانی سکھائی تھی، داستان گوئی نہیں۔ یہ قول البتہ مشکوک ہے کہ میر فدا علی کو "بڑے منشی جی" اور جاہ کو "چھوٹے منشی جی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ داستان کی کسی جلد میں، اور نہ ہی

کسی اور معاصر یا قریب العہد مطبوعہ ماخذ میں ''بڑے منشی جی'' اور ''چھوٹے منشی جی'' کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد حسین جاہ کے ایک استاد میر فدا علی صاحب المتخلص بہ فدا تھے اور وہ داستان گوئی میں نہیں بلکہ فن نثاری یا نثر خوانی میں ان استاد تھے۔

نیر مسعود کے کتب خانے میں ایک چھوٹی سی کتاب ''طریق نثر خوانی'' ہے۔ بتیس صفحوں کے اس رسالے کے آخری صفحے پر اس کی تاریخ تکمیل ''در شہر عظیم آباد پٹنہ بتاریخ بست و چہارم ماہ ربیع الاول سن [کذا] تیرہ سو چھ ۱۳۰۶ ہجری'' درج ہے [مطابق ۳۰ نومبر ۱۸۸۸]۔ اسی صفحے کے حاشیے پر کئی تاریخیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۸۹ میں منطبع ہوا۔ مثلاً مرزا علی حسین خوشنویس نے تاریخ لکھی ہے۔

طبع شد ایں نسخہ چوں صورت گل در جہاں
غنچۂ طبعم شگفت ہچو گل بوستاں
غلغلۂ خوبی اش تا سر سدرہ رسید
از رہ تحسیں کشود بلبل سدرہ زباں
داد بتاریخ طبع مژدہ بایں مصرعم
آمدہ از نخل طور ایں ثمر نیک داں
۱۸۸۹

یہ کتاب چھپی تو نامی پریس لکھنؤ سے، لیکن میر فدا علی صاحب خود غالباً لکھنوی نہ تھے، کیوں کہ ان کے نام کے ساتھ ''لکھنوی'' کا لفظ کہیں نہیں ملتا ہے۔ کتاب کے سرورق پر خوبصورت خط شکستہ میں غالباً مصنف کے قلم سے دائیں جانب میں لکھا ہوا ہے: ہدیہ سید فدا علی نثر خواں۔ بائیں جانب مصنف ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے: جناب بچھلے صاحب۔ یہاں بھی لفظ ''لکھنوی'' درج نہیں۔ امکان ہے کہ سید فدا علی کا وطن عظیم آباد رہا ہو، اور جن نثر خواں کے وہ شاگرد تھے ان کا تخلص ''طور'' رہا ہو کہ ان کا ذکر منقولہ بالا قطعۂ تاریخ کے آخری مصرعے میں ہے۔ میر فدا علی نے اپنے رسالے ''طریق نثر خوانی'' میں اپنے شاگردوں کی جو فہرست دی ہے اس میں دور دور کے نام ملتے ہیں۔ صفحہ ۳۱ پر تیسرے شاگرد کا نام یوں

درج ہے: ''سید محمد حسین متخلص بہ جاہ صاحب کتاب ماتم حسین و مترجم طلسم ہوشربا۔'' اس تفصیل کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ میر فدا علی فدا کے شاگردوں میں ہمارے داستان گو محمد حسین جاہ بھی تھے۔ پھر صفحہ ۳۲ پر فن نثر خوانی میں خود جاہ کے ایک شاگرد کا ذکر یوں ہے: ''سید کاظم حسین ساکن مراد آباد شاگرد سید محمد حسین جاہ۔'' اس اندراج سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جاہ کو نثاری میں اس قدر شہرت حاصل تھی کہ لکھنؤ سے بہت دور مراد آباد میں بھی ان کے شاگرد موجود تھے۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جاہ نے اپنا تذکرہ بطور نثار یا نثر خواں کہیں نہیں کیا ہے۔ ارباب پریس کی طرف سے داستان گو کے جو القاب و محاسن لکھے جاتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ جاہ کی جلدوں کی بعض اوائلی اشاعتوں میں انھیں ''مصائب خواں'' ضرور کہا گیا ہے، ''نثار'' یا ''نثر خواں'' نہیں کہا گیا۔ مثلاً ''طلسم ہوش ربا''، جلد اول، کی چوتھی کانپوری اشاعت (۱۸۹۸) کے سرورق پر مصنف کے بارے میں یہ عبارت ہے (اوقاف میرے لگائے ہوئے ہیں):

ناظم و نثار زماں، داستان گوے شیریں زباں، سخن سنج، مصائب خواں، پسندیدۂ مجالس امیران و رئیساں، سخنور خوش پایگاہ، جناب منشی محمد حسین، متخلص بہ جاہ

ملحوظ رہے کہ یہ الفاظ محمد حسین جاہ کی ہر جلد پر نہیں مندرج ہیں، اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ رسوم و مناصب عزاداری میں ''نثر خواں'' یا ''نثار'' ضرور ایک منصب ہے اور ''مصائب خوانی'' اس کا ایک صیغہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے جاہ نے اپنے لئے ''مصائب خواں'' کا لقب اس لئے مقرر کر لیا ہو کہ وہ بوجوہ خود کو نثر خواں کہلانا پسند نہ کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جاہ نے اپنے بارے میں کہیں بھی نہیں لکھا ہے کہ میں نثار ہوں۔ ان کے برخلاف احمد حسین قمر جا بجا اپنی نثاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ''طریق نثر خوانی'' کا وجود نہ ہوتا تو ہم اس بات سے بالکل بے خبر رہتے کہ جاہ کو نثر خوانی میں بھی دخل تھا۔ ''طریق نثر خوانی'' کے بارے میں اطلاع اور اس تک اپنی دسترس کے لئے میں اپنے دوست نیر مسعود کا ممنون ہوں۔

ہم آگے دیکھیں گے کہ شیخ تصدق حسین کو بھی ''مصائب خواں'' کہا گیا ہے۔ اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ''نثر خوانی'' ہی کا ایک صیغہ ''مصائب خوانی'' بھی رہا ہوگا۔

جاہ کے بارے میں خود داستان میں جو تھوڑی بہت باتیں ہیں ان میں کئی لوگوں کے نام جاہ

کے استادوں کی حیثیت سے مذکور ملتے ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم (نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۱۲، ص ۹۵۷) پر جاہ کی لکھی ہوئی ایک تاریخ درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''از محمد حسین جاہ مترجم و مولف طلسم ہٰذا تلمیذ سحر مرحوم۔'' سحر کی کچھ تفصیل درج نہیں، لیکن چونکہ صرف تخلص لکھا ہے تو اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی مشہور شخصیت رہے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا انتقال ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم کی پہلی طباعت کے کچھ مدت پہلے ہوا ہو۔ بہر حال، یہ دوسری بات تو بالکل مفروضہ ہے، لیکن پہلی بات کے ٹھیک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سحر، لکھنؤ کے مشہور استاد امان علی سحر ہوں۔

حسرت موہانی نے ''تذکرۂ شعرا'' کے نام سے متفرق مضامین تذکرے کے رنگ میں، لیکن جدید انداز کے حامل، لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ کو احمر لاری نے ''تذکرۂ شعرا'' کے نام سے ۱۹۷۲ میں شائع کر دیا۔ پھر شفقت رضوی نے تمام تذکروں کو یکجا کر کے ''تذکرۃ الشعرا'' کے نام سے ایک نہایت ضخیم جلد مع حواشی و استدراکات شائع کی (کراچی، ۱۹۹۹)۔ موخر الذکر کے صفحہ ۵۸۳ پر امان علی سحر کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور وہاں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۰۴، اور تخمینی تاریخ وفات ۱۸۸۵ لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس تاریخ میں دو مشکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسی ''تذکرۃ الشعرا'' کے صفحہ ۵۸۴ پر صفیر بلگرامی شاگرد امان علی سحر کے تذکرے ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے یہ درج ہے کہ سحر کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ کے فرو ہونے پر کانپور سے لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ صفیر بلگرامی چونکہ سحر کے شاگرد تھے لہٰذا توقع کی جا سکتی ہے کہ انھیں اپنے استاد کی تاریخ وفات معلوم ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سحر کا انتقال کبھی ۱۸۵۸ میں ہوا اور یہاں ''تذکرۃ الشعرا'' میں ۱۸۸۵ سہو کاتب ہے۔ دوسری بات یہ کہ سحر کا دیوان ''ریاض سحر'' مطبوعہ مطبع کارنامۂ لکھنؤ مورخہ ۱۲۹۰ مطابق ۱۸۷۲ / ۱۸۷۳ میرے پیش نظر ہے۔ اس میں سحر کو مرحوم لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اگر یہ تاریخ اشاعت درست ہے تو امان علی سحر کا انتقال مارچ ۱۸۷۲ (آغاز سال ۱۲۹۰ ہجری) کے پہلے ہو چکا تھا۔ تاریخ کی درستی کی شرط میں نے اس لئے لگائی کہ ممکن ہے یہ اشاعت ۱۸۷۲ / ۱۸۷۳ کے بعد کی ہو، لیکن اس پر تاریخ اول اشاعت کی (۱۲۹۰ ہجری مطابق ۱۸۷۲ / ۱۸۷۳) ہی رہنے دی گئی ہو۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ سعادت خاں ناصر کا تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' ۱۸۴۶ کے آس پاس

شروع کیا گیا لیکن اس میں ترمیمیں اور اضافے ۱۸۷۱، یا کم سے کم ۱۸۶۹ تک کیے جاتے رہے۔ اس تذکرے میں سحر کے اشعار یہ لکھ کر درج کیے گئے ہیں، ''یہ اشعار اس سے یادگار۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ عبارت لکھی گئی اس وقت امان علی سحر کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا اغلب ہے کہ سحر کا انتقال ۱۸۵۸ میں کبھی ہوا ہو، جیسا کہ ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کا امکان کم ہو جاتا ہے کہ جاہ کے نظم کردہ قطعۂ تاریخ کے عنوان میں جاہ کو جس ''سحر مرحوم'' کا شاگرد بتایا گیا ہے، وہ یہی شیخ امان علی سحر، شاگرد ناسخ تھے۔ لیکن چونکہ امان علی سحر کے بارے میں کوئی بیان یا گمان ان کے داستان گو ہونے کا نہیں ہے، لہٰذا اغلب ہے کہ اگر وہ (یعنی امان علی سحر یا کوئی اور سحر) جاہ کے استاد تھے بھی تو فن داستان گوئی میں نہیں بلکہ فن شاعری میں تھے۔

''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم، کی اسی اشاعت میں صفحہ ۹۶۱ پر ایک قطعہ تاریخ حسب ذیل عنوان سے ہے:

تاریخ از حضرت اوستادی گوہر آبدار معنی کے صدف
منشی اشرف علی اشرف مرحوم خوش نویس اعلیٰ پایگاہ مطبع اودھ اخبار

اس قطعے کا پہلا شعر ہے ۔

ہیں شاگرد میرے محمد حسین
لقب ان کا ہے جاہ با صد وقار

اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ محمد حسین جاہ کے ایک استاد اشرف علی المتخلص بہ اشرف بھی تھے، اور یہ صاحب مطبع اودھ اخبار (یعنی نول کشور پریس) کے ''خوش نویس اعلیٰ'' تھے۔ قطعۂ زیر بحث میں کوئی اشارہ اس بات کا نہیں کہ جاہ اور اشرف میں استادی شاگردی کا رشتہ کس علم کی نسبت سے تھا۔ لیکن اغلب ہے کہ جاہ خوش نویس بھی رہے ہوں، یا خوش نویس بننے کا انھوں نے اوائل عمری میں ارادہ کیا ہو اور اس سلسلے سے وہ اشرف کے شاگرد ہوئے ہوں۔ محمد حسین جاہ نے خوش نویسی کبھی بطور پیشہ یا مشغلہ اختیار کی ہو، اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ امیر حسن نورانی کی کتاب ''منشی نول کشور اور ان کے خطاط اور خوش نویس''

(نئی دہلی، ۱۹۹۴) کے صفحات ۶۴ تا ۶۶ پر منشی اشرف علی اشرف کا حال ملتا ہے۔ لیکن جاہ کی شاگردی کا کوئی ذکر وہاں نہیں ہے، اور نہ ہی اشرف یا جاہ کے شاعرانہ مرتبے پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد حسین جاہ نے خوش نویسی میں اشرف علی اشرف کی شاگردی ضرور کی ہوگی، لیکن بحیثیت خوش نویس انھوں نے کوئی نقوش نہیں چھوڑے۔ احترام الدین شاغل کی ''صحیفۂ خوش نویساں'' میں اشرف کا ذکر ہے نہ جاہ کا۔ جاہ کا مذکور نہ ہو تو کچھ حیرت نہیں، لیکن اشرف، جنھوں نے فیضی کی ''سواطع الالہام'' جیسی کڈھب کتاب کی کتابت نہایت جانفشانی اور حسن اور درستی سے کی تھی، ان کا نام نہ ہونا تعجب اور افسوس کی بات ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کے لائق ہے کہ خوش نویسی میں چاہے جاہ نے کوئی نام نہ حاصل کیا ہو، لیکن ''طلسم ہوش ربا'' میں ان کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر وہ اعلیٰ درجے تھے اور شاعری کے فن میں اپنے استاد کے لئے انھیں مایۂ افتخار کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال، یہ بات یقینی ہے کہ شاعری کے فن میں جاہ کو سحر تخلص کے کسی شاعر سے تلمذ تھا اور ''سحر'' شاید امان علی سحر ہوں۔ اور یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ خوش نویسی میں وہ منشی اشرف علی اشرف کے شاگرد تھے۔ لیکن داستان گوئی میں کس کے شاگرد تھے، یہ معاملہ اب بھی بہت پیچیدہ ہے۔ گیان چند کے قول کو درست مانیں تو کسی میر فدا علی عرف ''بڑے منشی'' نے جاہ کو داستان گوئی سکھائی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، پروفیسر گیان چند نے اپنی اطلاع کا ماخذ نہیں درج کیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ محض اطلاع ہے، تاریخی بیان نہیں کہی جا سکتی، خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں کسی منشی فدا علی عرف ''بڑے منشی'' کے بارے میں کسی اور ماخذ سے کچھ نہیں ملتا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ میر فدا علی متخلص بہ فدا نامی ایک صاحب نے جاہ کو نثر خوانی نہ کہ داستان گوئی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن ایک عجیب بات یہ کہ ''طلسم فصاحت'' کے ۱۸۸۱ ایڈیشن میں جاہ نے احمد حسین قمر کو اپنا استاد کہا ہے اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ میں نے ۱۸۸۱ ایڈیشن کا ذکر بطور خاص کیا ہے، کیونکہ ۱۸۷۴ کا ایڈیشن (یعنی اول ایڈیشن) میرے پیش نظر نہیں، لیکن ۱۸۸۱ کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔ ''طلسم فصاحت'' کے ۱۸۸۱ ایڈیشن کے صفحہ ۲۷۸ پر البتہ حسب ذیل عنوان سے جاہ کی ایک بہت طویل عبارت چھاپی گئی ہے:

## توصیف جناب اوستاد منشی احمد حسین صاحب قمر کہ داستان گوئی میں جن کا حقیر شاگرد ہے اور فسانہ کو دکھایا ہے

اس کے بعد قمر کی تعریف میں وہ وہ مبالغے جاہ نے کئے ہیں اور اپنی خاکساری کا ایسا بیان کیا ہے کہ کبھی کبھی گمان گذرتا ہے کہ جاہ سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ احمد حسین قمر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یعنی ایک امکان یہ ہے کہ قمر نے شاید کبھی جھوٹا دعویٰ کیا ہو کہ جاہ میرے شاگرد ہیں، اور جاہ اب اس کا بدلہ نکال رہے ہوں۔ یا دوسرا امکان یہ ہے وہ کبھی قمر کے شاگرد تھے اور بعد میں نا چاقی کی بنا پر جاہ ان سے الگ ہو لئے، اور اب یہاں اپنی داستان کے شائع ہو جانے کے تفاخر میں قمر کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ یا پھر وہ اہل زمانہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جنھیں شاید خیال تھا کہ محمد حسین جاہ نے داستان گوئی کا فن احمد حسین قمر سے حاصل کیا ہو گا۔ لیکن مذاق اڑانا، اور وہ بھی اس بے دردی سے، خواہ قمر کا، خواہ اہل زمانہ کا، بہر حال مستبعد ہے۔ اس میں دو قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ جاہ کی جو تحریریں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کسی عبارت سے کہیں بھی کوئی کینہ یا اس طرح کی سنگ دلی نہیں مترشح ہوتی کہ وہ کسی شخص کے بارے میں، چاہے وہ ان کا سابق استاد یا مبینہ استاد یا ہم پیشہ رقیب کیوں نہ ہو، ایسے انداز کی تحریر لکھ سکتے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مانا محمد حسین جاہ اتنے ہی کینہ پرور تھے، لیکن منشی نول کشور کب گوارا کرتے کہ احمد حسین قمر کے خلاف ان کی ذاتی مخاصمت اور عناد ان کے یہاں کی کسی کتاب کے صفحات پر یوں منعکس ہو کہ معاصرین فوراً بات کی تہ کو پہنچ جائیں۔ منشی نول کشور مرحوم بہر حال صلح کل کے آدمی تھے اور بزرگوں کی وضع کے پابند تھے۔ یہ بات تقریباً غیر ممکن ہے کہ ان کے پریس سے شائع شدہ کسی کتاب میں کوئی معاصر مصنف کسی اور کے بارے میں اپنے دل کا غبار نکالے۔

لیکن اس بات کو کیا کیجئے کہ اگر جاہ نے قمر کا مذاق اڑا کر ان کی توہین نہیں کی ہے تو زیر بحث عبارت میں انھوں نے احمد حسین قمر کی مدح میں مبالغے اور تفرّس وتعرب کی وہ شان دکھائی ہے کہ ابو الفضل یاد آجاتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر نہ پڑھیں تو عبارت سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ کتابت کے (بظاہر) اغلاط بہت سے ہیں۔ بہر حال، نمونہ ملاحظہ ہو (ص ص ۲۷۸ تا ۲۷۹):

جس وقت تمام فسانہ زیب تحریر ہوا، حضرت اوستاد سے یوں عرض پیرایہ حقیر ہوا کہ اگر اصلاح حضور کی ہو جائے، روسیاہی چہرۂ کتاب کی دھو جائے، الفاظ و مضامین کا وہ رنگ بندھے اور وہ معنی غریب پیدا ہوں، کہ وضع لطافتِ رسم الخط سے شیوۂ دلبری ہویدا ہو کر مانند معشوقِ عشوہ سنج با کرشمہ و ناز کے، یہ کتاب آمادۂ دلبری اور دلداری مشتاقان باوفا ہو، سوادِ اسطار تحریر حرف زنِ شام سوسنی رنگ ہو... جس وقت شمع زبانِ رشک کلیم کی روشنی اصلاح بخشے، صفحہ غیرت دہِ طور بن کر شعلہ وار فانوس خیال معشوقاں و مشتاقاں دم زنی نسیم گفتار شرربار حضور لامع النور سے چشم مردمان بصارت میں جلوہ گری کرے۔ جب یہ الفاظ مجہول، موصل تلفظ اثبات تقریر، سامنے حضرت کے کئے، زبان معجز بیان نے دامن حال میں شکستہ بال کے یوں گوہر افشاں ہوئے کہ ''تو نے ناحق بے فائدہ میرا سر پھرایا، اور اپنے تئیں بھی انگشت نمائے چشم آہو گیراں بنایا۔ یہ تمام کتاب لائق اصلاح کب ہے؟ تیری یہ یاوہ گوئی سراسر بے مطلب ہے۔'' میں نے پھر دست عجز دامن اقدس پر مارا۔ ہٹ کر کے عرض کیا کہ ''گل را از خار، و ساحل را از خس و خاشاک، ننگ و عار نمی باشد۔ میں اس تکلیف دہی سے باز نہ آؤں گا، تمام کتاب دکھلاؤں گا۔'' اس وقت، کہ مجھ پر نہایت پرورش اور لطف و کرم فرماتے ہیں، سراسری بہ نگاہ کرم اس قلزم بحر زخار معنی نے چشمۂ کتاب کو سیراب اصلاح فرمایا۔ کم ترین، لب تشنۂ آب مضمون، ساحل مطلب سے آشنا ہوا۔ یہ ایک قطرہ اس کے فیض عمیم اور لطف دریائے حلم کا ہے۔ زہے نہنگ بحر علمیت و شاعری، و خجے مہر سپہر سخنوری، کہ اگر زبان پارسی میں شمع زباں سے شعر، لمعہ پذیر ہو، ہر شعشۂ حرف پر زردشت، حسن سخن زند کو اپنے، نثار آتش کدۂ بیان کرے...

وغیرہ وغیرہ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ سب سنجیدگی سے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن بہر حال کتاب ہمارے سامنے ہے۔ میرے پیش نظر ''طلسم فصاحت'' کے اس نسخے کی فوٹو نقل ہے جو میں نے بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ سے خود حاصل کی تھی۔ اس وقت میں نے یہ غور نہ کیا تھا کہ اس نسخے میں صفحات ۲۸۱ تا ۲۸۴

موجود نہیں ہیں۔ اس نسخے میں صفحہ ۲۸۵ پر کسی اور صاحب کی تقریظ گذشتہ صفحے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ تقریظ خود محمد حسین جاہ کی مدح میں ہے اور صفحہ ۲۸۶ پر ختم ہوتی ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ احمد حسین قمر کی تعریف میں جاہ نے خدا جانے کیا کیا مزید شگوفے چھوڑے ہیں۔ ممکن ہے پوری عبارت سامنے ہو تو اس عجیب وغریب تحریر کا کچھ ٹھیک سے مطلب نکل سکے۔ اور یہ بھی کرید تھی کہ جاہ کی مدح میں تقریظ کن صاحب کی تحریر کردہ ہے۔ ٹورانٹو میں مقیم انگریزی کے ناول نگار اور داستان کے لائق طالب علم میرے دوست مشرف فاروقی جو حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کے چھوٹے بھائی کے پوتے ہیں، انھوں نے داستان امیر حمزہ (یک جلدی) کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اب وہ ''طلسم ہوشربا'' پر کام کر رہے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے ٹورانٹو یونیورسٹی لائبریری سے ''طلسم فصاحت'' کے صفحات ۲۸۱ تا ۲۸۴ کی فوٹو نقل از راہ کرم مجھے بھیج دی۔ ٹورانٹو یونیورسٹی لائبریری کا ایڈیشن ۱۸۸۴ کا نکلا اور ان صفحات کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ احمد حسین قمر کا ذکر اس ایڈیشن سے بالکل غائب ہے۔

جاہ نے ۱۸۸۴ کے ایڈیشن میں خاتمۂ افسانہ میں تھوڑی بہت عبارت گھٹا بڑھا کر داستان کو صفحہ ۲۸۲ کی پہلی سطر پر تمام کر دیا ہے۔ پھر صفحہ ۲۸۴ کے وسط تک تاریخیں ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے پر جاہ کی مدح میں وہ تقریظ شروع ہوتی ہے جس کا ایک حصہ ۱۸۸۱ ایڈیشن کے آخری ڈیڑھ صفحے (۲۸۵/۲۸۶) میں نظر آتا ہے اور کتاب اسی پر تمت بالخیر ہوتی ہے۔ ٹورانٹو سے مرسلہ صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریظ کے مصنف ''حضرت ابوالفتح شمس الدین سلطان محمد علی نقی میرزا صفوی عرف صاحب عالم وارث ایران مرحوم ومغفور'' ہیں۔ ان صاحب کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا، سوا اس کے کہ وہ ۱۸۷۴ میں (یا ۱۸۸۱ کے پہلے) اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں معلومات ہمارے لئے ضروری بھی نہیں۔ اصل دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ۱۸۸۴ کے ایڈیشن میں وہ مبالغہ آمیز، مفرس ومعرب تمدیح احمد حسین قمر موجود نہیں جو ۱۸۸۱ کے ایڈیشن میں تھی (اور ممکن ہے کہ ۱۸۷۴ کے بھی ایڈیشن میں رہی ہو)۔

احمد حسین قمر کی مدح کے حضور وغیاب سے ہم کئی نتیجے نکال سکتے ہیں، لیکن کوئی بھی نتیجہ حتمی نہیں کہا جا سکتا:

(۱) جاہ کو قمر سے تلمذ نہ تھا۔ لیکن قمر نے شاید کہیں کہہ دیا، یا لکھ دیا کہ جاہ میرے شاگرد ہیں۔ لہٰذا جب ۱۸۸۱ میں ''طلسم فصاحت'' کا نیا ایڈیشن چھپا تو جاہ نے یہ عبارت لکھ کر قمر کی ہنسی اڑائی۔ بعد میں کسی بنا پر (ممکن ہے منشی نول کشور کی فہمائش پر) انھوں نے وہ ساری عبارت حذف کردی، یا وہ عبارت منشی صاحب کے حکم پر حذف کردی گئی۔

(۲) جاہ کو قمر سے تلمذ تھا، بعد میں ناچاقی ہوگئی۔ یہ ناچاقی ۱۸۸۱ کے بعد ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۸۱ کے بعد جو ایڈیشن ''طلسم فصاحت'' کا نکلا، اس میں جاہ نے قمر کی توصیف پر مبنی عبارت حذف کردی۔

(۳) جاہ کو قمر سے تلمذ نہ تھا۔ انھوں نے پیشہ ورانہ رشک کی بنا پر قمر کو ذلیل کرنے کے لئے تاکید المدح بمایشبہ الذم پر مبنی عبارت لکھی۔

(۴) قمر نے کہیں یہ دعویٰ کردیا کہ محمد حسین جاہ تو میرے چھوٹے بھائی ہیں، یعنی مجھ سے بہت کم ہیں۔ یہ بات غلط لیکن بے ضرر تھی، لیکن جاہ کو بہت بری لگی لہٰذا انھوں نے بدلہ یوں نکالا کہ قمر کو اپنا استاد لکھا، لیکن اس انداز میں کہ جاننے والے جان گئے کہ یہ قمر کو ذلیل کرنے کا طریقہ ہے۔

(۵) یہ سارے کا سارا کوئی عملی مذاق (Practical Joke) تھا، جسے بعد میں خود جاہ نے مسترد کردیا۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا میں سے کوئی توجیہ پوری طرح مطمئن نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہے کہ جاہ نے کبھی قمر کی شاگردی کی ہو، لیکن یہ بھی ہے قمر اپنے ''رقیبوں'' یا ''حاسدوں'' پر طنز و تشنیع کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے جاہ کا نام لئے بغیر ان کی خوب برائیاں کی ہیں، لیکن کہیں دور کا اشارہ بھی نہیں کیا کہ جاہ میرے شاگرد رہ چکے ہیں یا وہ میرے چھوٹے بھائی ہیں یا میرے لئے چھوٹے بھائی کی طرح ہیں۔ قمر کے مزاج میں بڑبولا پن بے حد تھا۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ جاہ ان کے شاگرد کبھی رہے ہوں اور قمر نے اس بات کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ یقیناً یہ ممکن ہے کہ قمر نے قسم کھالی ہو کہ ''طلسم فصاحت'' کی توہین

آمیز عبارت کے بعد اب میں کوئی اشارہ بھی نہ کروں گا کہ جاہ میرے شاگرد رہے ہیں۔ لیکن یہ امکان بھی بہت کمزور سا ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں مجھے پہلا امکان زیادہ قرین قیاس لگتا ہے۔ اور جاہ کے خلاف قمر کے دل میں جو تلخی نظر آتی ہے، اس کی توجیہ بھی امکان نمبر ایک کے ذریعہ بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے۔

اپنے معاصر یا بزرگ داستان گویوں میں جاہ نے انبا پرشاد رسا کا ذکر کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم (نول کشور پریس کانپور، ۱۹۱۰، صفحہ ۷۹۵) میں وہ ''انبہ پرشاد صاحب جو ایک بڑے داستان گو لکھنؤ کے تھے'' کے حوالے ایک وقوعے کا ایک روپ بیان کرتے ہیں جو ''صاحب دفتر'' کے بیان کئے ہوئے روپ سے ذرا مختلف ہے۔ اسی جلد کے صفحہ ۸۷۹ پر وہ انبا پرشاد کی ایک یازدہ شعری اردو مثنوی ان کے نام سے نقل کرتے ہیں۔

شیخ تصدق حسین کو بھی محمد حسین جاہ نے نہایت فیاضانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم (طبع نول شور پریس، کانپور، ۱۹۱۰، ص ۴۹۳) میں جاہ نے لکھا ہے:

> صاحب دفتر نے حال جہانگیر نہیں لکھا ہے، بلکہ یہ ٹکڑا میرے ایک دوست تصدق حسین نامی داستان گو ہیں، انھوں نے خود بیان کیا تھا، اپنی طبیعت سے۔ اس کو داستان کہنے والوں نے پسند کر کے محفلوں میں قصہ خوانی کے بیان کیا، اور ہر شخص نے لکھنؤ میں سنا۔ پس میں نے بخیال اس کے کہ ناظرین میرے کلام کے بھی اس داستان سے حظ اٹھائیں، و نیز کوئی یہ نہ کہے کہ اتنا مضمون ہم نے قصہ خواں سے زیادہ سنا تھا، اس کتاب میں وہ نہیں ہے، کیونکہ یہ داستان مشہور بہت ہو چکی تھی۔

میر احمد علی کا نسبۃً تفصیلی ذکر جعفر علی ہنر فیض آبادی نے ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم، کی تقریظ (ص ۹۶۰) میں کیا ہے۔ اور یہ ذکر اس طرح ہے کہ جاہ کی تعریف تو ہے ہی، لیکن میر احمد علی کو بھی خراج عقیدت پیش کر دیا گیا ہے۔ ہنر فیض آبادی لکھتے ہیں:

> اس دفتر داستان کو فیضی علیہ الرحمہ نے بہ زبان فارسی لکھا تھا جس میں بڑی بڑی داستانوں کا صرف پتہ تھا۔ اس میں سے میر احمد علی صاحب داستان گو نے اس

طلسم کو داستان کہنے والوں کے لئے پتے دار لکھا تھا۔ وہ بھی دستیاب ہونا کمال دشوار تھا۔ جاہ صاحب موصوف نے سعی بے شمار و تلاش بسیار فرما کر بہم پہنچایا...

''طلسم ہوش ربا''، جلد چہارم، کے صفحہ ۶۷۶ پر جاہ نے قمر کے شعر نقل کئے ہیں۔ اگر جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کی طباعت میں ان کے شریک مہتمم سید محمد اسمٰعیل کو داستان گو محمد اسمٰعیل اثر فرض کیا جائے تو یہ بھی ایک معاصر داستان گو کا حوالہ کہا جا سکتا ہے جو ہمیں جاہ کے یہاں احترام کے انداز میں ملتا ہے۔ علاوہ بریں، جاہ نے اپنی جلد پنجم کے آخر میں دوبارہ میر احمد علی اور منشی انبا پرشاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے ساتھ انھوں نے ایک اور داستان گو ''امیر خاں'' کا نام بھی لیا ہے کہ وہ بھی داستان گوئی میں ماہر ہیں اور میں نے ان سے بھی داستان طلسم ہوش ربا کو حاصل کیا ہے۔ جاہ کی پوری عبارت پڑھنے کے قابل ہے (اوقاف میرے لگائے ہوئے ہیں):

> یہی دفتر ہوش ربا تین طور پر اس حقیر کے پاس ہے۔ ایک منشی انبہ پرشاد صاحب جو نامی داستان گو تھے، ان کا لکھا ہوا، اور میر احمد علی صاحب سر آمد داستان گویان ہند کا تصنیف [کردہ]، دوسرا امیر خاں صاحب کا، کہ وہ بھی داستان گوئی میں یکتا ہیں اور ان کے دفتر کا تمام عالم کو اشتیاق ہے۔ تیسرا دفتر جو نواب صاحب والی رامپور نے بصرف زر کثیر تیار فرمایا تھا۔
>
> (''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، از محمد حسین جاہ، صفحہ ۲۴۰)

نواب رامپور کا ''دفتر'' ممکن ہے رہا ہو، ممکن ہے نہ رہا ہو، اور میر احمد علی اور انبا پرشاد کے ہی ''دفتر'' در اصل رامپوری دفتر رہے ہوں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ احمد حسین قمر کے علی الرغم، جو ساری داستان کا موجد خود کو قرار دیتے ہیں، جاہ نے ایک بزرگ اور دو معاصر داستان گویوں کو فیاضانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ بات ان کی سلامت طبع کی دلیل ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ انھوں نے احمد حسین قمر کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا، لیکن شاید یہی مناسب بھی تھا۔

محمد حسین جاہ نے کیا عمر پائی، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، انھوں نے شیخ تصدق حسین کو اپنا دوست لکھا ہے، اور شیخ تصدق حسین غالباً احمد حسین قمر سے چھوٹے

تھے، جیسا کہ آئندہ صراحت کی جائے گی۔ اگر محمد حسین جاہ نے ۱۸۹۳ سے پہلے وفات پائی، جیسا کہ تقریباً یقینی ہے، اور قمر نے ۱۹۰۱ میں داعی اجل کو لبیک کہا، جیسا کہ معلوم ہے، تو محمد حسین جاہ نے نسبۃً کم سنی میں انتقال کیا ہوگا۔

محمد حسین جاہ کی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کہنا فی الحال غیر ممکن ہے، بجز اس کے کہ معاصر اور بزرگ داستان گویوں کے تئیں ان کا دوستانہ اور فراخ دلانہ رویہ ان کی سلامت طبع اور نیک مزاجی کی دلیل ہے۔

## احمد حسین قمر (وفات، ذی قعدہ ۱۳۱۸، مطابق فروری-مارچ ۱۹۰۱)

قمر کے انتقال کی تاریخ ہمیں "ہومان نامہ"، مصنفہ احمد حسین قمر، مطبوعہ ۱۹۰۱، کی تقریظ بطور خاتمۃ الطبع مصنفۂ اشتیاق حسین سہیل میں ملتی ہے۔ سہیل، جو قمر کے بیٹے تھے، لکھتے ہیں (ص ۸۱۴):

> حقیقت میں یہ طرز بیان اور طلاقت زبان اور دلچسپی حالات، والد ماجد صاحب کا حصۂ خداداد ہے۔ کوئی اس میں شریک وسہیم نہیں ہوسکتا۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ایسے ہمہ داں اور باکمال اور ہر دل عزیز کا انتقال ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۸ ہجری میں ہو گیا۔ احقر کے نزدیک تو داستان طرازی کا چراغ گل ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر گیان چند نے احمد حسین قمر کے بارے میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے (صفحہ ۷۳۰) کہ "۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں قمر کے دو بھائی کام آئے۔ ذریعۂ معاش کے طور پر قمر نے وکالت کی سند حاصل کرنا چاہی لیکن اس میں ناکام رہنے پر داستان گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔" گیان چند نے ان بیانات کا ماخذ نہیں واضح کیا ہے۔ لیکن "طلسم ہوش ربا"، جلد ششم، کے آغاز میں قمر نے اپنے بارے میں حسب ذیل معلومات درج کی ہیں (کانپور، نول کشور پریس، ۱۸۹۳، ص ۳-۴)۔ اغلب ہے کہ گیان چند نے یہ اطلاعات وہیں سے اخذ کی ہوں:

> حالات حقیر پر تقصیر سے ناظرین والا مقام آگاہ ہوں کہ یہ داستان سرائی پیشہ جدو آبائی

نہیں ہے۔ایام غدر باغیان میں قریب پل آہنی آس روے گومتی مکان سکونت اس حقیر کا تھا۔ بروقت آمد فوج سرکاری چونکہ دو بھائی راقم کے مرزا بندہ حسن و بندہ حسین حسین، ناظم علاقۂ بھندرو، کولہو، اگاڑھ، وغیرہ تھے، اور حقیر بھی علاقۂ متعلقۂ امام باغ، جاگیر نواب علی نقی خان مرحوم [ کا ناظم ] تھا، فوج ظفر موج دروازے پر موجود تھی، لڑائی ہوئی۔ دونوں بھائی و بسیار کس ملازمان قدیم سیار گلشن جناں ہوئے۔ حقیر بعنایت رب اکبر بچ گیا۔ جرم بغاوت سے بریت ہوئی، مگر مکانات و جائداد و علاقہ وغیرہ قریب سہ لاکھ روپیہ ضبط سرکار ہوئے۔ بہ سبب صغر سنی دعویٰ اس کا نہ کرسکا۔ وراثت جد و آبا سے محروم رہا۔ اول قانون یاد کر کے برابر کچہری میں مختاری کی۔ جب وقت امتحان آیا، اسی جرم بغاوت میں امتحان نا منظور ہوا۔ اس وقت سے طبیعت بہلانے کو شوق داستان سرائی ہوا۔ چونکہ کوئی وجہ معاش نہ تھی، رزاق مطلق نے اس پیشے میں سواد کامل عطا فرمایا۔ دیگر نثر خوانی مصائب آل عبا علیہ التحیۃ والثنا اختیار کی۔ اس میں بھی سرکار مظلوم کربلا سے تاثیر عطا ہوئی۔ جا بجا شہروں میں پڑھنے کی نوبت آئی۔ رئیسان والا مقام نے مقبول فرمایا۔ ہر خاص و عام رئیسان ذوی الاحتشام عزت بڑھاتے ہیں، ان دونوں میں وحید فرماتے ہیں۔

قمر کے بڑبولے پن، اور زیب داستاں کے لئے تھوڑے سے مبالغے اور تضاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی مندرجہ بالا اقتباس سے جو تصویر سامنے آتی ہے وہ لکھنؤ کے ایک پڑھے لکھے، باعزت گھرانے کے فرد کی ہے جس پر وہی کچھ بیتی جو لکھنؤ کے اکثر ہندو مسلمان شرفا پر اس زمانے میں گذری تھی۔ مندرجہ بالا بیان میں قمر نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی (یعنی ''طلسم ہوش ربا''، جلد ششم، کی تصنیف و اشاعت، ۱۸۹۲ / ۱۸۹۳ کے وقت) وہ شاعری اور داستان گوئی دونوں کام کرتے ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم، (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۱) کے صفحہ ۶۲۸ پر قمر کہتے ہیں:

شیوۂ نثر خوانی اس قدر کمتر ہے کہ صاحبان تصنیف اتنے بڑے شہر لکھنؤ میں دو صاحب ہیں، تیسرا یہ حقیر اس زمرے میں درج ہوا...جب سے نثر شروع کی، بیان کرنا

داستان کا بہت شاق ہوتا ہے۔ مجبور ہوں کہ اس فن خاص داستان سرائی میں رئیسان
عظام طلب فرماتے ہیں۔ ترک مناسب نہ جان کر بہ مجبوری اختیار کیا۔

منقولہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قمر کی نگاہ میں داستان گوئی کا درجہ شاری سے فروتر تھا۔ یا ممکن ہے یہ صرف ایک طریقہ ہو یہ اشارہ کرنے کا کہ وہ خود کو اصلاً شار اور مداح اہل بیت سمجھتے ہیں، اور ان کا بس چلتا تو داستان گوئی ترک کر دیتے۔ بالفاظ دیگر، قمر ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ پیشہ ور داستان گویوں سے کئی مدارج بلند تھے ہیں۔ اسی لے میں ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ ''مورخ'' ہیں۔ ''بقیہ طلسم ہوش ربا''، جلد اول (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۱) کے صفحہ ۶۸۴ سے ایک کردار کی زبان سے انھوں نے کہلایا ہے:

ہلال سحر افگن نے کہا، ''بوا، ایسے ہزار معرکے گذرے۔ قمر صاحب نے جو جلدیں لکھی
ہیں ان کو ملاحظہ کرو۔ ایسا مورخ کوئی نہیں گذرا، خود مصنف ہیں۔''

احمد حسین قمر کی اولادوں میں اشتیاق حسین سہیل کے نام سے ہم واقف ہیں۔ بظاہر وہ داستان گو نہ تھے، لیکن شعر کہتے تھے، صرف تخلص کے گنہ گار نہ تھے۔ قمر کی کم سے کم ایک بیٹی بھی تھیں۔ ان کے شوہر، یعنی قمر کے داماد نادر مرزا عرف نواب دولہا کی ایک تقریظ ''طلسم ہوش ربا''، جلد ہفتم، کے آخر میں (ص ۱۰۷۵) درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نادر مرزا کو داستان گوئی بطور پیشہ اختیار کرنے کا شوق تھا، لیکن ''عارضہ فیل پا میں مبتلا ہو کر مجبور و لاچار'' ہو کر کام ترک کرنا پڑا،'' ورنہ [بیماری سے پہلے] تاثیر نگاہ کیمیا خاصیت جناب سے بڑے بڑے جلسوں میں'' داستان سنانے کا اتفاق انھیں ہو چکا تھا۔ فیل پا (Elephantiasis) کے ذکر سے گمان گذرتا ہے کہ نادر مرزا کا وطن گورکھ پور یا اس کے اطراف میں کہیں ہوگا کیوں کہ فیل پا کا مرض انھیں جوار میں متداول تھا۔

اوپر میں نے قمر کے بڑبولے پن کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود بینی کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں کینہ بھی بہت تھا۔ ہم محمد حسین جاہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ معاصرین اور بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے میں کمی نہیں کرتے، لیکن قمر نے جابجا اپنے معاصروں کی برائی کی ہے، اور عموماً بہت اوچھے اور بے صبرے انداز میں، گویا انھیں عدم تحفظ کا شدید احساس ہو اور انھیں فکر ہو کہ میں اپنی تعریف خود ہی

کرلوں، شاید کوئی دوسرا تعریف کرے کہ نہ کرے، یا شاید اس دریادلی اور جوش سے نہ کرے جس کا میں متمنی اور مستحق ہوں۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ بالکل بے موقع وہ خود کو داستان گوئی اور نثاری میں ''وحید'' بتا رہے ہیں۔ معاصرین کے بارے میں کبھی کوئی اچھا لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔ بزرگوں میں میر احمد علی کے بارے میں دنیا جانتی تھی (اور آج بھی داستان کے طالب علم واقف ہیں) کہ ''طلسم ہوش ربا'' در اصل ان کی تصنیف، یا تخلیق تھا، اس معنی میں کہ میر احمد علی سے پہلے اس داستان کو کسی نے بیان نہیں کیا۔ لیکن احمد حسین قمر ان کو بھی کوئی رتبہ دینے کو تیار نہیں، بلکہ انھیں بالکل بے حقیقت بتانا چاہتے ہیں۔

''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۲) کے صفحہ ۴ پر احمد حسین قمر لکھتے ہیں کہ منشی نول کشور نے ان سے کہا:

> تعجب کا مقام ہے کہ آپ ایسا کامل و اکمل داستان گو، وحید عصر شاعر و نثار، ہر فن میں ذی وقار، لکھنؤ میں موجود ہے۔ افسوس ہم کو قبل خبر نہ ہوئی... اگر قبل آپ سے نیاز ہوتا تو یہ چار جلدیں جو طبع ہوئی ہیں، آپ ہی سے ان کا ترجمہ کراتے اور لکھواتے... دفتر ہوش ربا آپ ہی کی سحر بیانی سے مشہور عالم ہوا، ورنہ کوئی اس کے نام سے بھی آگاہ نہ تھا۔

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۹۳۱) کے صفحات ۹۲۷-۹۲۸ پر ارشاد ہوتا ہے:

> ابھی تک کسی مقام پر قواعد طلسم ہوش ربا نہیں تحریر کیے۔ جب خیال آتا ہے قلب اس حقیر کا تھراتا ہے... جو صاحب اس کے مصنف مشہور ہیں، جناب میر احمد علی صاحب مرحوم و مغفور، انھوں نے چند اجزا تحریر فرمائے۔ وہ پردۂ کتمان میں تھے۔ جب حقیر نے ان اجزا کو پایا، داستان ہائے لطیف و عیاری ہائے ظریف جا بجا بڑھائیں، قواعد درج کیے... داستان جہانگیر اپنی ذات سے تصنیف کر کے شامل طلسم ہوش ربا کی۔
>
> محرر ہر چار جلد نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ... بہت سی داستانیں اصل طلسم ہوش ربا کی نہیں ہیں۔ مجھ کو دستیاب ہوئیں، میں نے تحریر کیں... یہ ان کے قلم سے نہیں معلوم کس وجہ سے نہ نکلا، یا تعصب نے تحریر کرنے نہ دیا کہ یہ کل داستانیں تصنیف کردۂ

منشی احمد حسین صاحب قمر ہیں۔ حقیر کو داستان گوئی پر ناز نہیں... یہ انقلاب فلکی اس امر کو اختیار کیا۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ محمد حسین جاہ تو اپنے معاصرین کو ''بڑا داستان گو''، ''میرے دوست، نامی داستان گو''، ''داستان گوئی میں یکتا'' کہہ کر پکارتے ہیں، اور قمر کو میر احمد علی جیسے قدیم اور بڑے داستان گو کی بھی شرکت اپنی ''تصنیف'' میں گوارا نہیں۔ جاہ کا تو نام بھی نہیں لیتے، انھیں ہر جگہ ''محرر'' کہتے ہیں۔ تنگ جبینی اس سے زیادہ کیا ہوگی۔ (مانا کہ یہ ممکن ہے کہ جاہ ان کے شاگرد رہے ہوں اور پھر برگشتہ ہو گئے ہوں، یا جاہ نے کسی ذاتی خفگی کے باعث قمر کی ہنسی اڑائی ہو، لیکن وہ سب پرانی باتیں اور معاصرانہ چشمکوں کے عام طریقے کی تھیں۔ ان باتوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔) دوسری بات یہ کہ وہ جاہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ جاہ نے پورے طلسم ہوش ربا، یا اس کے بعض بہت عمدہ مناظر اور وقوعوں کی ''تصنیف'' کا سہرا اپنے سر باندھ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہ نے ایسا کہیں بھی نہیں لکھا۔ اس کے علی الرغم، مندرجہ بالا اقتباس میں قمر نے داستان جہانگیر کی ایجاد کا تمغا البتہ اپنے گلے میں لٹکا لیا ہے، حالانکہ جاہ نے صاف لکھا ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) کہ یہ داستان شیخ تصدق حسین کی اختراع ہے اور سارا شہر اسے شیخ تصدق حسین سے سن چکا ہے۔ یہ ادائیں تو قمر کی ہیں کہ وہ شیخ تصدق حسین کیا، میر احمد علی تک کو بے دخل کر دینے کے درپے ہیں۔ جاہ پر ان کا الزام کہ وہ کتمان حق کے مرتکب ہوتے ہیں، سراسر کینہ توزی ہے۔ پھر، دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے مصداق وہ داستان جہانگیر اور چند خاص الخاص داستانوں کی ''تصنیف'' کے دعوے سے بڑھ کر ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم کے فوراً بعد جلد ششم میں یہ بھی کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ طلسم ''سراپا'' (یعنی تمام وکمال) ان کا تصنیف کردہ ہے۔

''طلسم ہوش ربا''، جلد ششم، (نول کشور پریس، کانپور، ۱۸۹۳) میں صفحہ ۱۱۷-۱۱۸ پر میر احمد علی اور جاہ دونوں کو سمیٹ کر احمد حسین قمر یوں گوہر افشانی کرتے ہیں:

واضح رائے ناظرین ہو کہ یہ حجرۂ ہفت بلا خاص ترتیب کردۂ حقیر ہے۔ مصنف اول [میر احمد علی] کو اس میں بالکل واقفیت نہیں... اس حقیر نے حجرۂ ہفت بلا کو اس طور سے ترتیب کیا کہ ایک ایک داستان اس کی فخر طلسم ہوش ربا ہے... دوسرا امر بھی واضح ہو کہ

جناب میر احمد علی صاحب مرحوم نے طلسم ظاہر کو زور دیا۔ جب طلسم کشا کو لوح ملی، وہ کیفیت باقی نہ رہی... جلد ہفتم میں بعد حصول لوح ذہانت وعدم ذہانت ظاہر ہو جائے گی۔ محرر ہر چہار جلد [محمد حسین جاہ] اگر طلسم باطن لکھے گا، دفتر اصلی کا نمونہ ہوگا۔ حقیر نے سراپا تصنیف کر کے نام تو البتہ طلسم ہوش ربا رہنے دیا، مگر کل داستان ہائے رنگین و فصاحت آئین کو تازہ کیا۔ سامعین بلند مقام وشاہزادگان ذوی الاحتشام سالہا سال سے زبان سے حقیر کی بخوبی سماعت فرما چکے ہیں۔

اس سے پہلے، لیکن اسی جلد میں، احمد حسین قمر اپنے حسن بیان کے علاوہ درا کی ذہن کے ثبوت میں عجب دلچسپ بات کہہ چکے ہیں (ص ۱۵۳):

رائے بیضائے ناظرین والاتمکین پر واضح ہو کہ یہ داستان شوکت بیان عجب طرح کے پیچ سے واقع ہوئی تھی، مگر حقیر پر تقصیر نے گنجلک اس کی نکالی، مضمون جلالت مشحون کو مثل آئینہ صاف وشفاف کیا۔

یہاں بے ساختہ سرسید کی عبارت یاد آتی ہے جو انھوں نے دہلی کے باکمال اہل فلسفہ کے لئے ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں لکھی تھی کہ ان حضرات کی طبع رسا ناخن عقل سے جزو لایتجزیٰ کو دو نیم کر دیتی ہے۔ قمر صاحب اپنے بارے میں کچھ ایسا ہی دعویٰ کر رہے ہیں۔ اپنی تعریف کی دھن میں وہ اٹھلا اٹھلا کر، چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ لوگ محظوظ بھی ہوں گے اور آمنا وصدقنا بھی کہیں گے۔ ایک مثال اوپر گذر چکی ہے جہاں وہ داستان کے ایک معمولی کردار کی زبان سے خود کو ''مورخ'' کا خطاب دلواتے ہیں۔ اب یہاں دیکھئے وہ افراسیاب بچارے کو نخاس یا چوک کا کوئی نیم خواندہ دوکان دار بنائے دیتے ہیں کہ کسی طرح تو اپنی ثنا کے پہلو نکلیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصہ دوم کے صفحہ ۸۶ پر ہے:

افراسیاب نے حرفوں پر نگاہ ڈالی، کہا: ''ارمی زبان دراز، دیکھ تو کیا لکھا ہے۔ سیاہی حروف دیکھ کر میری آنکھوں میں اندھیرا آ گیا ہے۔ ارے عربی فارسی پڑھنے والوں کو لاؤ۔ اس میں عربی لکھا ہے، جلد ترجمہ کراؤ۔ اس تحریر پر پیچ کو مترجم صاحب سمجھیں

گے۔منشی احمد حسین قمر کو بلاؤ، وہ ترجمہ بہت صاف کریں گے۔میں نے عبارت ان کی دیکھی ہے۔زبان صاف و شفاف، ہر طفل و جوان، خواندہ ناخواندہ، خاص عام نے ان کی زبان کو پسند کیا ہے۔رؤسا نے شہنشاہ سخنوراں خطاب دیا ہے۔

ممکن ہے یہ ظریفانہ تحریر لکھنے کی کوش ہو، لیکن ''اس تحریر پر پیچ'' سے جو عبارت شروع ہوتی ہے وہ ظریفانہ نہیں، نچلے درجے کی تعلی و مباہات ہے۔ ''طلسم نوخیز جمشیدی''، جلد سوم (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۲) کے صفحہ ۱۰۱۹ پر اپنے مرحوم باپ کے بارے میں اشتیاق حسین سہیل لکھتے ہیں کہ قمر کی ''طبیعت کی روانی دیکھنے بلکہ سننے میں بھی نہیں آئی۔'' اغلب ہے کہ یہ روانی انھیں تحریر میں بے اعتدالی کی طرف بھی لئے چلی جاتی ہو۔

احمد حسین قمر نے کیا عمر پائی، اس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔گمان غالب ہے کہ وہ محمد حسین جاہ سے عمر میں بڑے رہے ہوں۔جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، قمر نے ۱۸۵۷ کے زمانے میں خود کو صغیر سن لکھا ہے۔اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۴۵ کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔شیخ تصدق حسین نے ''بالا باختر'' (نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۰۰) کے صفحہ ۳ پر انھیں ''مدظلہٗ'' لکھا ہے۔اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جاہ اور شیخ تصدق حسین دونوں ان سے چھوٹے رہے ہوں گے۔

مندرجہ بالا معلومات کے ساتھ احمد حسین قمر کے بارے میں ہماری اطلاعات کا ذخیرہ ختم ہوتا ہے۔مشہور محقق مرزا کاظم علی خاں کا کچھ نسبی رشتہ احمد حسین قمر سے ہے۔میری درخواست پر انھوں نے خاندان کے بڑے بوڑھوں سے قمر یا ان کے اخلاف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

## شیخ تصدق حسین (انتقال، مابین ۱۹۱۱ و ۱۹۱۷)

یہ وضاحت اب شاید بہت ضروری نہ ہو کہ شیخ تصدق حسین داستان گو، اور سید تصدق حسین، مصحح مطبع نول کشور و صاحب ''لغات کشوری'' دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔لیکن سید تصدق حسین کا بھی تھوڑا

سا تعلق ذکر داستان گویاں سے ہے۔ سید تصدق حسین نے عبداللہ بلگرامی کی یک جلدی داستان امیر حمزہ کے ۱۸۸۷ ایڈیشن کے مصحح کی حیثیت سے اس پر نظر ثانی کی تھی۔ اس داستان کی اول اشاعت ۱۸۷۱ میں ہوئی تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں، یہ دراصل غالب لکھنوی کے ترجمۂ داستان امیر حمزہ، مطبوعہ کولکتہ، ۱۸۵۵ کی تقریباً ہو بہو نقل ہے۔ بہر حال، ۱۸۸۷ کا ایڈیشن میرے پیش نظر نہیں ہے لہٰذا یہ بات طے کرنا میرے لئے اب مشکل ہے کہ تصحیح کے نام پر سید تصدق حسین نے داستان کی عبارت میں کیا تبدیلیاں کیں۔ اس داستان کے جدید ترین ایڈیشن (۱۹۶۹) میں مولانا عبدالباری آسی کی ''تصحیحات'' بھی شامل ہیں۔ مختلف نسخے جو میرے پاس ہیں، ان سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ غالب لکھنوی کا متن اب بھی کم و بیش قائم ہے۔ قطع برید بہت کم کی گئی ہے، اضافے کہیں کہیں ہیں، لیکن بہت معمولی حجم کے ہیں۔ میرا خیال ہے سید تصدق حسین نے اشعار بہت بڑھا دیئے تھے اور آسی نے انھیں برائے نام رہنے دیا۔ غالب لکھنوی کے یہاں اشعار بہت کم ہیں۔ اس طرح آسی کی ''تصحیحات'' نے بلگرامی کے متن کو غالب لکھنوی کے متن سے قریب تر کر دیا۔

گیان چند نے عشرت لکھنوی کے حوالے سے لکھا ہے (صفحہ ۷۳۲) کہ ''تصدق حسین جاہل تھے اور کاتبوں سے لکھواتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔'' گیان چند نے مسعود حسن رضوی ادیب کے قول کا ماخذ نہیں بتایا، اس لئے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ تصدق حسین نقد بصارت سے تہی کیسہ تھے۔ لیکن خود داستان میں جا بجا تصدق حسین کے بارے میں ذکر اس امر کا ملتا ہے کہ وہ ''لکھتے'' تھے۔ ''تورج نامہ''، جلد اول (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۶) میں صفحہ ۴۷۷ پر نواب دولہا عرف جبن صاحب المتخلص بہ کاشف کی تاریخ ہے۔ اس میں تصدق حسین کے بارے میں کہا گیا ہے۔

قصہ گوئی میں ہیں وہ لا ثانی

اور کرتے ہیں مرثیہ خوانی

خوش بیاں خوش اساس خوش تقریر

کھینچتے ہیں زبان سے تصویر

اس سے معلوم ہوا کہ تصدق حسین مرثیہ خواں بھی تھے اور زبانی لیاقت خوب رکھتے تھے۔ ان کے نابینا ہونے، یا امی ہونے، کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی داستان میں اگلے صفحے پر خود شیخ تصدق حسین کی طرف سے "التماس بخدمت ناظرین" ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> فن انشا پردازی مشکل ہے، اور میں ایک ہیچ مداں، کج مج زباں زلہ ربائے کاملین، خوشہ چین محققین قدیم، کم استعداد، کیا ہوں جو دعویٰ کروں... میں نے حسب الحکم منشی صاحب [پراگ نرائن بھارگو] جو کچھ برا بھلا ہوسکا قلم بند کیا۔

یہاں ایک بات تو سامنے کی ہے کہ شیخ تصدق حسین کہتے ہیں، میں نے "قلم بند کیا۔" امی ہونے یا بے بصارت ہونے کا کوئی اشارہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ خود کو انشا پرداز کہتے ہیں، اور صاف صاف خود کو بزرگوں کا مقلد و متبع اور کاملین و محققین خوشہ چین بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امی ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا، کہ فوراً اس کی تردید کا امکان ہے۔ پھر اسی صفحے پر میرن صاحب آبرو لکھنوی کی تقریظ شروع ہوتی ہے جس میں ہم پڑھتے ہیں:

> جناب منشی تصدق حسین صاحب داستان سرا و مصائب خوان حضرت خامس آل عبا ہیں... علاوہ اس نسخہ کے اور بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور وہ مرغوب خاص و عام ہوئیں... [صفحہ ۶۷۷] اب دفتر لعل نامہ... مترجم صاحب اس کا ترجمہ فرمارہے ہیں... بعبارت سلیس اس دفتر کو تحریر کررہے ہیں۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تصدق حسین کو مرثیہ خوانی کے علاوہ نثاری میں بھی درک تھا۔ (یا ممکن ہے کہ آبرو لکھنوی نے ان کی مرثیہ خوانی ہی کو مصائب خوانی خامس آل عبا کہہ دیا ہو۔ لیکن جاہ کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ "مصائب خواں" تھے، اور جاہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے "نثر خوانی" کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔) بہر حال یہ ثابت ہے کہ آبرو لکھنوی کے خیال میں شیخ تصدق حسین صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ اور پھر آبرو لکھنوی نے بھی تصدق حسین کے لئے "تحریر کررہے ہیں" کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ لہٰذا ان کے امی یا/اور نابینا ہونے کا امکان کالمعدوم ہو جاتا ہے۔

"بالا باختر" میں شیخ تصدق حسین نے اپنا کچھ تعارف لکھا ہے اور وہاں ایک بات ایسی لکھی

ہے جو یہاں لائق ذکر ہے۔ یہ عبارت ایسی ہے کہ ذرا مفصل اقتباس کا تقاضا کرتی ہے۔ صفحہ ۳ (مطبوعہ نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۰۰) پر لکھا ہے:

> سر گشتۂ محادی جہالت و بے خودی، نابلد کوچۂ براعت و بخردی، خوشہ چین خوان بزم اہل کمال، زلہ ربائے بساط ارباب جاہ وجلال، اذل کونین شیخ تصدق حسین داستان گو خدمت ناظرین با تمکین میں بصد ادب ملتمس ہے کہ اس حقیر پر تقصیر کو ابتدائے سن شعور سے داستان گوئی کا شوق تھا اور ماہرین اس فن کی خدمت گذاری میں بسر کرتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کم مائگی اور عدم لیاقت علمی سدراہ تھی، تاہم امراو رؤسا و دیگر صنادید شہر نے اپنی عالی ہمتی سے اس کج زبان کے بیان کو پسند فرمایا۔ اور بموجب المرء یقیس علیٰ نفسہٖ اچھے لوگ بھی اس ردخلائق کو اچھا سمجھنے لگے... کمترین کو مثل بعض حضرات ستودہ صفات کے اپنی رطب اللسانی اور خوش بیانی کا دعویٰ نہیں...

یہاں کئی باتیں توجہ طلب ہیں۔ اول تو یہ کہ اپنے بارے میں شیخ تصدق حسین کا یہ کہنا کہ علمی کم مائگی اور عدم استعدادان کی داستان گوئی میں سدراہ تھی، محض رسمی بیان ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے وہ معرب و ثقیل زبان لکھتے ہیں اور عربی کی ایک کہاوت بھی ڈال دیتے ہیں (انسان دوسروں کو خود پر قیاس کرتا ہے، یا بقول غالب ع اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا)۔ دوسری بات یہ کہ داستان گوئی جہلا کا فن نہیں ہے۔ اس کے لئے ''لیاقت علمی'' ضروری ہے۔ شیخ تصدق حسین کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ داستان گوئی کے مزاج شناس تھے اور اس فن کے بارے میں ان کی رائے وہی تھی جو قدیم ماہرین فن کی تھی، اور جس کا تفصیلی تذکرہ ہم اس کتاب کی جلد اول میں پڑھ چکے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ تصدق حسین کو بھی احمد حسین قمر کی عادت خودستائی اچھی نہیں لگتی اور وہ ان پر ہلکی سی چوٹ بھی کر دیتے ہیں (''کم ترین کو... دعویٰ نہیں'')۔ چوتھی بات یہ کہ آگے چل کر اسی عبارت میں انھوں نے احمد حسین قمر کو ''مدظلہٗ'' کہا ہے۔ لہٰذا وہ عمر میں قمر سے چھوٹے تھے۔

''گلستان باختر''، جلد سوم (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۷) کے اندرونی سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

غرض ہر طرح سے یہ [دفتر] مصنف مرحوم کی آخری یادگار ہے۔امید ہے کہ حضرات ناظرین اس سے محظوظ ہو کر ان مرحوم کو دعاے خیر سے یادفرمائیں گے۔اور بقیہ کتابیں ان کی تصنیف کردہ جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں،وہ بھی خدانے چاہا تو عنقریب چھپ کر شائع ہوں گی۔

یہ بات الجھن پیدا کرتی ہے کہ وہ ''بقیہ کتابیں'' شیخ تصدق حسین کی زندگی میں کیوں نہ چھپ سکیں، اور اس سے بڑھ کر الجھن میں ڈالنے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۰۹ میں ''گلستان باختر'' کی اول دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ پھر یہ تیسری جلد اسی سال کیوں نہ چھپی، اور جب چھپی تو اتنی مدت بعد کیوں؟اس غیر مطبوعہ جلد کا،اوران دوسری ''تصنیفات'' کا، جو چھپیں نہیں،کوئی معاوضہ شیخ تصدق حسین یا ان کے ورثا کو ملا کہ نہیں،اس کے بارے میں بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔فی الحال گیان چند (بحوالۂ امیر حسن نورانی) یہی کہا جاسکتا ہے کہ تصدق حسین کی دو داستانیں غیر مطبوعہ رہیں،ایک تو ''داستان چرخ گرداں'' جو ایک ہزار صفحات کی ہے،اور دوسری تین جلدوں اور دو ہزار صفحات پر محیط ''انیس دلربا''۔ یہ موخر الذکر داستان اپنی جگہ پر الگ ہے،اس کا تعلق داستان امیر حمزہ سے نہیں۔

''گلستان باختر'' کی اول دو جلدیں ۱۹۰۹ میں شائع ہوئیں۔گمان غالب ہے کہ تیسری جلد بھی اس وقت تیار ہو چکی ہوگی۔اس تیسری جلد کے بعد ہم شیخ تصدق حسین کی کسی تحریر کا ذکر نہیں سنتے۔لہٰذا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شیخ تصدق حسین کا انتقال ۱۹۰۹ ہی میں ہو گیا اور ان کے مرجانے کے باعث ارباب مطبع کی توجہ ان کی طرف سے ہٹ گئی،حتیٰ کہ ''گلستان باختر'' کی تکمیل شدہ جلد سوم کو بھی انھوں نے سرد خانے میں ڈال دیا۔پھر کبھی بعد میں انھیں خیال آیا ہوگا کہ لاؤ یہ تیسری جلد بھی چھاپ لیں، اور انھوں نے ۱۹۱۷ میں اسے چھاپ لیا، حالانکہ داستان کی نئی جلدوں کی اشاعت ۱۹۰۹ میں عملاً ختم ہو چکی تھی اور اس سال کے بعد جو بھی داستانیں چھپیں وہ پہلے کی مطبوعہ داستانوں کی جدید طباعتیں تھیں۔یعنی داستان طویل کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۰۹ میں کیوں ختم ہو گیا اور ''گلستان باختر'' کی جلد سوم کی اشاعت اتنی مدت بعد ۱۹۱۷ میں کیوں ہوئی، اس کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔جلد سوم کے بارے میں ارباب مطبع کا یہ کہنا کہ ''ہر طرح سے یہ [دفتر] مصنف مرحوم کی آخری یادگار ہے''،اس خیال کو تقویت

دیتا ہے کہ شیخ تصدق حسین نے ۱۹۰۹ ہی میں جلد سوم کو مکمل کر لیا تھا اور اس کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

یہ استدلال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن نولکشور پریس لکھنؤ، کانپور اور لاہور کی وضاحتی فہرست برائے ۱۹۱۱ میں شیخ تصدق حسین کا نام اس طرح لکھا گیا ہے کہ جس طرح زندوں کا نام لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ''نوشیرواں نامہ'' کا اندراج وہاں حسب ذیل الفاظ میں ہے:

> دفتر اول نوشیرواں نامہ۔ ترجمہ شیخ تصدق حسین صاحب داستان گوے قدیم سخن گوے شیریں مقال و بذلہ بےمثال جو اس فن کے نکتہ دان و دقیقہ شناس ہیں، انھوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

اگر یہ عبارت کسی پرانے ایڈیشن سے ہو بہو نقل نہیں کر دی گئی ہے تو یہاں صیغۂ حال کا استعمال بالکل صاف بتا رہا ہے کہ تصدق حسین ابھی بقید حیات ہیں۔ اس اندراج کے بعد اس فہرست میں شیخ تصدق حسین کو ''موصوف الصدر''، ''ممدوح الصدر''، ''مسبوق الذکر'' کہا گیا ہے۔ پھر ''گلستان باختر''، جلد سوم، کے بارے میں درج ہے کہ جلد دوم'' کے بعد تیسری جلد ہو گی جس میں کل داستانوں کا اختتام ہے، جو ابھی زیر طبع ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''گلستان باختر''، سوم، کا مسودہ ۱۹۱۱ میں زیر طبع تھا، یا ہونے والا تھا، اور اس وقت تصدق حسین بھی زندہ تھے۔ لہٰذا گمان یہ گذرتا ہے کہ ارباب مطبع نے کسی بنا پر ''گلستان باختر''، سوم، کی اشاعت روک دی تھی اور پھر تلافی مافات کے طور پر اسے ۱۹۱۷ میں شیخ تصدق حسین کی موت کے بعد شائع کیا۔ اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شیخ تصدق حسین کا انتقال ۱۹۱۱ اور ۱۹۱۷ کے درمیان ہوا۔

محمد حسین جاہ شاید احمد حسین قمر کے شاگرد تھے، یا شاید کسی کے شاگرد نہ تھے۔ قمر کے سلسلے میں کسی استاد کا نام نہیں آتا۔ خود قمر کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ خود آموز تھے۔ شیخ تصدق حسین نے البتہ اپنے استاد میر اعظم علی کا ذکر کیا ہے (''آفتاب شجاعت''، جلد پنجم، حصۂ دوم، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۸، ص ۱۲۷)۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھوں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ استاد کا نام محفوظ ہو جائے،

کیونکہ وقوعہ زیر بیان میں جو تبدیلی شیخ تصدق حسین نے اپنے استاد سے منسوب کی ہے وہ بہت غیر اہم اور معمولی ہے۔

گذشتہ جلد میں ہم اس مسئلے پر بحث کر چکے ہیں کہ ''آفتاب شجاعت'' (اور خاص کر اس کی جلد پنجم، حصہ اول ) کی تالیف میں آرزو لکھنوی کا کوئی حصہ تھا کہ نہیں۔ وہاں اس بات پر بھی بحث ہے کہ جس طرح آرزو لکھنوی نے اپنا نام بیچ داستان میں ڈالا ہے، اور خود کو داستان گو بتایا ہے، اس سے کئی طرح کے سوالات اور امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگر شیخ تصدق حسین نابینا تھے، یا امی تھے، تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ کسی نے (یا آرزو لکھنوی نے ) شیخ تصدق حسین کی لاعلمی میں ایسا کچھ کھیل کھیل دیا ہو۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بوجہ پیرانہ سری یا علالت، شیخ تصدق حسین نے یہ داستان آرزو لکھنوی کو املا کرائی ہو اور مسودے کو خود نہ دیکھا ہو اور اس طرح آرزو لکھنوی کو مسودے میں تحریف و اضافہ کرنے کا موقع مل گیا ہو۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ساری ہی داستان آرزو لکھنوی نے ایک طرح تصدق حسین کے لئے ٹھیکے پر لکھی ہو۔ اس بحث کو اس کتاب کی جلد اول کے صفحات ۳۶۴ تا ۳۶۹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ شیخ تصدق حسین پڑھے لکھے نہ تھے، یا آنکھوں سے معذور تھے۔ بلکہ شہادت اگر ہے تو اس بات کی ہے کہ وہ نہ حرف ناشناس تھے نہ امّی۔ ''تورج نامہ''، جلد اول کی تقریظ مصنفہ میرن صاحب آبرو کا ذکر آچکا ہے۔ اس تقریظ کے تقریباً آخر میں میرن صاحب آبرو کہتے ہیں (ص ۷۷۶) کہ شیخ تصدق حسین نے متعدد ''دفاتر'' مثلاً ''ایرج نامہ'' وغیرہ ''بڑی فکر سے تحریر کئے'' اور ''شکر ہے کہ مرغوب خاص و عام ہوئے''۔ پھر:

> ایک دن جناب ممدوح [شیخ تصدق حسین] نے مجھے یہ نسخہ [''تورج نامہ''] دکھایا، کچھ پڑھ کے بھی سنایا۔ مجھے بہت پسند آیا۔

اگر یہ بیان درست ہے (اور اس کے جھوٹ ہونے کی کوئی وجہ بظاہر نہیں) تو شیخ تصدق حسین کے بارے میں یہ روایتیں غلط ہیں کہ وہ ناخواندہ یا نابینا تھے۔

## سید محمد اسمٰعیل اثر (وفات، قبل ۱۹۲۷)

ان کے بارے میں گیان چند نے اتنا ہی لکھا ہے کہ ''صندلی نامہ'' ان کی تصنیف ہے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک ذرا سا امکان ہے کہ اسمٰعیل اثر نے محمد حسین جاہ کی شراکت میں جاہ کی ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، شائع کی ہو۔ طباعت اور اشاعت کی نگرانی اور انتظام کا تجربہ اسمٰعیل اثر کو تھا، اس بات کی شہادت ہمیں شیخ تصدق حسین سے ملتی ہے۔ ''تورج نامہ''، جلد اول (مطبوعہ ۱۹۰۶) کے صفحہ ۳-۴ پر شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں کہ ''صندلی نامہ''، ''تورج نامہ''، اور ''لعل نامہ'' کی اشاعتیں ''بہ نگرانی و انتظام سخنور بے عدیل مولوی محمد اسمٰعیل صاحب متخلص بہ اثر اہلکار قدیم مطبع ''اودھ اخبار'' کو پہنچیں۔'' ارباب مطبع کا بیان ہے کہ ''آفتاب شجاعت'' جلد دوم کی ''ترتیب و تصحیح'' اسمٰعیل اثر نے کی۔ ''آفتاب شجاعت، جلد سوم کے سرورق پر درج ہے کہ اسے تصدق حسین نے ''بہ اعانت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اثر'' لکھا۔ ''طلسم زعفران زار سلیمانی''، جلد اول (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۵) کے سرورق پر درج ہے کہ اس داستان کی ''تکمیل''، شیخ تصدق حسین نے ''بہ اعانت'' مولوی محمد اسمٰعیل اثر کی۔ اسی جلد کے صفحہ ۹۱۶ پر درج ہے کہ اس داستان کو:

> منشی احمد حسین صاحب قمر مرحوم نے آغاز کیا تھا اور شیخ تصدق حسین صاحب داستان گو نے اختتام کو پہنچایا، اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اثر کار پرداز قدیم مطبع نے بہ عبارت شائستہ و طرز بائستہ ترتیب دیا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اصطلاحوں کے اس وفور میں عقل حیران ہے۔ ''نگرانی و انتظام''؛ ''ترتیب و تصحیح''؛ ''اعانت''؛ ''ترتیب بہ عبارت شائستہ و طرز بائستہ''؛ ان میں کیا اور کتنا فرق ہے؟ مثلاً ''اعانت'' سے شراکت تصنیف مراد ہے، یا محض املا کے مطابق لکھنے کا مشینی عمل، یا حافظے کو بر انگیخت کرنے اور ادھوری داستانوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اشارے (اصطلاح میں ''پتے'') فراہم کرنا مراد ہے؟ کچھ بات کھلتی نہیں، لیکن اس میں شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ محمد اسمٰعیل اثر نے صرف ''صندلی نامہ'' نہیں لکھی، بلکہ وہ اور بھی کئی داستانوں کی ''ترتیب، تکمیل'' اور اشاعت میں سرگرم رہے۔

''صندلی نامہ'' کی دو اشاعتیں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک تو اشاعت دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۱)، اور دوسری چہارم (ایضاً، ۱۹۲۷)۔ دونوں میں داستان گو کا نام بالالتزام ''سید محمد اسمٰعیل

'' لکھا ملتا ہے۔ جو اشاعت ۱۹۰۱ کی ہے، اس میں '' سید محمد اسمٰعیل، متخلص بہ اثر'' لکھا ہے، اور ۱۹۲۷ کی اشاعت میں '' سید محمد اسمٰعیل المتخلص بہ اثر'' لکھا ہے۔ ایک خفیف سا شک گذرنا فطری ہے کہ '' سید محمد اسمٰعیل اثر'' داستان گو، اور '' مولوی محمد اسمٰعیل اثر'' دو الگ شخصیتیں تو نہیں؟ لیکن اس مفروضے کے لئے کوئی ثبوت کیا، کوئی کچی بنیاد بھی نہیں مل سکی ہے اور یہ بہت ہی بعید از قیاس ہے کہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی جگہ پر، دو اشخاص ہوں جن کا نام، نسب، اور تخلص، سب ایک ہوں۔ لہٰذا فی الحال یہی کہنا چاہئے کہ '' سید محمد اسمٰعیل اثر'' اور '' مولوی محمد اسمٰعیل اثر'' ایک ہی شخص ہیں۔ '' تورج نامہ''، جلد دوم کے ۱۹۲۷ ایڈیشن (نول کشور پریس، لکھنؤ) کے خاتمۃ الطبع میں صرف '' مولوی محمد اسمٰعیل'' لکھا ہے اور ساتھ میں '' مرحوم'' کا بھی لفظ ہے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی شخص ہیں، یعنی سید محمد اسمٰعیل اثر، صاحب داستان '' صندلی نامہ''، بعض داستانوں کی اشاعت کے منتظم و نگراں '' مولوی محمد اسمٰعیل اثر''، اور '' مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم'' ایک ہی شخص ہیں، اور یہ صاحب ۱۹۲۷ کے پہلے راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔

یہ امکان بھی بہر حال باقی ہے کہ جن '' سید محمد اسمٰعیل'' کے '' اہتمام'' میں جاہ کی جلد پنجم شائع ہوئی (۱۸۹۰) یہ بھی وہی '' سید محمد اسمٰعیل اثر'' ہیں جن کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، رفاقت علی شاہد کا خیال ہے کہ جاہ کی جلد پنجم والے سید محمد اسمٰعیل اور مذکورہ بالا اسمٰعیل صاحبان ایک ہی ہیں۔ اس قیاس کو رد کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات ذرا بعید از قیاس لگتی ہے کہ سید محمد اسمٰعیل اثر، صاحب '' صندلی نامہ''، نے جاہ کے ساتھ ہی خود بھی نول کشور پریس چھوڑ دیا ہو اور بعد میں وہ پریس سے دوبارہ منسلک ہو گئے ہوں۔

## پیارے مرزا

پیارے مرزا کے بارے میں گیان چند نے لکھا ہے (ص ۷۳۴-۷۳۵) کہ وہ '' مرزا محسن علی خاں عرف آغا جو ہندی کے شاگرد تھے اور انھوں نے شیخ تصدق حسین کی مدد سے '' تورج نامہ''، جلد اول لکھی۔ ان کا خاص کام '' بوستان خیال'' کے لکھنوی ترجمے کی ترتیب ہے۔'' لیکن معاملہ اس سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ اول تو یہ کہ '' تورج نامہ'' جلد اول (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنو، ۱۹۰۶) کے سرورق،

اور اس کے بعد پبلشر کے اشتہار (صفحہ ۷۷۶) پر لکھا ہے کہ اس داستان کے اصل "مترجم" پیارے مرزا ہیں اور یہ ترجمہ انھوں نے شیخ تصدق حسین کی "اعانت" (سرورق) اور "استعانت" (ص ۷۷۶) سے کیا ہے۔ لیکن خود شیخ تصدق حسین کا بیان اسی جلد کے صفحہ ۷۷۵ پر حسب ذیل ہے:

> ...کتاب لاجواب ونسخۂ انتخاب الموسوم بہ 'تورج نامہ"...اس خاکسار، ذرۂ بے مقدار، اذل کونین، شیخ تصدق حسین نے موافق اپنی فکر قلیل کے تالیف کیا۔

یہاں ایک نئی اصطلاح "تالیف" نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ تصدق حسین اس جلد پر پیارے مرزا کے علی الرغم اپنا حق اور اپنا دعواے ملکیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات میرن صاحب آبرو کی تقریظ سے بھی متبادر ہوتی ہے۔ اسی صفحے (۷۷۵) پر میرن صاحب آبرو کا قول ہے:

> سبحان اللہ اردو بھی کیا پیاری زبان ہے...گواہ اس تقریر کا...کتاب بے مثال "تورج نامہ" دفتر ہفتم داستان امیر حمزہ جس کے مترجم جناب منشی تصدق حسین صاحب داستان سرا و مصائب خوان حضرت خامس آل عبا ہیں۔

"تورج نامہ"، جلد دوم کی "تصنیف" یا "ترجمہ" کے بارے میں بھی پیچیدگیاں ہیں۔ میرے پیش نظر ۱۹۲۷ (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ) کا ایڈیشن ہے۔ اس کے سرورق پر صاف لکھا ہے کہ اس داستان کو:

> شاعر شیریں زباں، ناثر خوش بیاں، منشی پیارے مرزا صاحب نے بااعانت داستان گوے بے نظیر شیخ تصدق حسین صاحب، تصنیف کیا۔

اب اسی جلد کا خاتمۃ الطبع ملاحظہ ہو (صفحہ ۱۲۸۸)۔ ارباب پریس کا بیان ہے کہ:

> ...کتاب "تورج نامہ" جلد دوم...از تالیفات...شیخ تصدق حسین صاحب و بہ تصحیح و ترتیب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم...زیور طبع سے آراستہ ہو کر...نور افزاے دیدۂ منتظراں ہوئی۔

یعنی سرورق پر پیارے مرزا اور ان کے معاون شیخ تصدق حسین، اندرونی صفحات پر صرف شیخ تصدق حسین، اور آخری صفحے پر شیخ تصدق حسین اور مولوی محمد اسمٰعیل۔ ناطقہ سر بہ گریباں نہ ہو تو کیا

کرے؟میں تو فی الحال اسی رائے کا ہوں کہ سرورق پر جو لکھا ہے وہ معتبر ہے،اور خاتمۃ الطبع میں اسمٰعیل اثر کا نام ۱۹۲۷ کی اشاعت میں شاید مصلحتاً بڑھایا گیا۔لیکن یہ مصلحت کیا تھی، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''تورج نام''،جلد دوم کی اول اشاعت میری دسترس میں نہیں،ورنہ یہ گتھی شاید کچھ سلجھ سکتی تھی۔

''تورج نامہ''، جلد دوم کے سرورق پر مہیا کردہ اطلاع کے بموجب پیارے مرزا شاعر بھی تھے۔اور یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں۔لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ فارسی کے شاعر رہے ہوں، کہ ان کے استاد آغا حجو ہندی کا کلام فارسی میں بکثرت ملتا ہے اور داستان میں بھی وافر مقدار میں درج کیا گیا ہے۔اردو کے شاعر وہ شاید نہ تھے۔آغا حجو ہندی کی فارسی ہندوستانی رنگ و مزاج کی،لیکن سلیس اور رواں ہے۔لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ پیارے مرزا نے آغا حجو ہندی کی شاگردی فن ترجمہ کے حصول کی غرض سے اختیار کی ہو۔آغا حجو ہندی نے''بوستان خیال'' کے لکھنوی ترجمے میں بہت کام کیا تھا۔

داستان امیر حمزہ کے داستان گویوں کے بارے میں ہماری موجودہ معلومات اتنی ہیں، بیدل نے سچ کہا ع

عالم ہمہ افسانۂ مادار دو ما ہیچ

خدا ان لوگوں کے ساتھ فضل وجود و کرم کا معاملہ کرے، یہ ہمارے ادب کے بڑے لوگ ہیں ☆☆

## باب ششم

## داستان کا افسانہ

اس کتاب کی جلد اول میں ہم دیکھ چکے ہیں (باب ہفتم، ''بیان کنندہ''، بالخصوص صفحات ۳۳۶تا۳۵۰) کہ بیان کنندہ'' جو بھی بیان کرے، اس کے پیچھے کوئی با اقتدار شخصیت ہوگی، اور وہ شخصیت اس کی داستان کی سچائی کی ذمہ دار ہوگی۔ یہ شخصیت علامتی بھی ہو سکتی ہے، اور حقیقی بھی۔'' اس بیان کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ داستان گو کی نظر میں حقیقت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح قائم ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب شیخ تصدق حسین نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ جو بات بیان ہو گئی اسے بدلنا غیر ممکن ہے۔ قصہ ایک بار قائم ہو گیا تو قائم ہو گیا، چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ ''طلسم زعفران زار سلیمانی'' جلد دوم، ۳۷۴تا۳۷۵پر شیخ تصدق حسین کہتے ہیں کہ احمد حسین قمر نے یہ دکھا کر غلطی کہ لوح طلسم نے افراسیاب کے خلاف اثر کیا۔ شیخ تصدق حسین کا کہنا ہے کہ لوح طلسم تو افراسیاب کے نام پر بنی ہی نہ تھی۔ اور لوح طلسم اسی کے لئے یا اسی کے خلاف کار آمد، یا موثر، ہو سکتی ہے جس کے لئے وہ بنی ہو۔ لیکن وہ مزید کہتے ہیں کہ جو ہو گیا، ہو گیا، اب اسے بدل نہیں سکتے۔ دوسری طرف وہ بات بھی ہے جو ہم نے جلد اول کے اختتام پر لکھی تھی کہ ایک چینی کہاوت کے مطابق'' کہنے سے کہانی بڑھتی ہے''۔ لہٰذا کہانی کا سچ ہونا، اور اس کا ہمیشہ کے لئے قائم رہنا، دونوں ہی تمام زبانی بیانیوں، اور خاص کر داستان کا تفاعل معلوم ہوتا ہے۔

افلاطون نے لکھا تھا کہ تحریر کی کمزوری یہ ہے کہ لکھا ہوا لفظ اپنی تصحیح نہیں کر سکتا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ لکھا ہوا لفظ اصولاً غیر معتبر ہوتا ہے، کہ اگر کسی نے کچھ غلط لکھ دیا ہے تو جب تک کاغذ پر وہ تحریر موجود ہے، وہ غلطی بھی قائم اور باقی رہے گی۔ اس نکتے کی روشنی میں زبانی بیانیہ کی قوت کا مزید احساس ہوتا ہے، کیونکہ عام حالات میں تو بولے ہوئے لفظ کی تصحیح کوئی نہ کوئی کر سکتا ہے، لیکن بیانیہ جب ایک بار وجود میں آگیا تو وہ وجود میں آگیا۔ اب کوئی اسے ہزار غلط کہے، بیان کنندہ کو جھوٹا بتائے، یہاں تک کہ یہ بھی کہہ دے کہ بیان کنندہ نے جو بات بیان کی ہے وہ ممکن ہی نہیں تھی، نہ عقلاً نہ عادتاً، لیکن پھر بھی، جو بیانیہ ایک بار بن چکا ہے وہ انسانی زندگی اور کائنات کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی بیانیے کی تلخیص بیان ہوتی ہے (خواہ وہ زبانی بیانیہ ہو یا تحریری بیانیہ ہو)، تلخیص ہمیشہ زمانہ حال ہی میں بیان ہوتی ہے۔ تلخیص تو الگ رہی، کسی بیانیے کا پلاٹ بھی اگر بیان کرنا ہو تو ہم زمانہ حاضر ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ انسان کا ذہنی رجحان، بلکہ اس کی افتادِ طبع اور داخلی ضرورت یہی ہے کہ وہ زبانی کہانی پر اعتبار کر لیتا ہے۔ اور جب تحریری بیانیہ وجود میں آیا تو یہی اعتبار بڑی حد تک تحریری بیانیے کو بھی نصیب ہو گیا۔ تحریری بیانیہ میں افسانہ نگار (مثلاً) ہمیں بتاتا ہے کہ ایک شخص کا نام گوپی ناتھ ہے اور وہ "بابو گوپی ناتھ" کہلاتا ہے۔ ہم اس پر یقین کر لیتے ہیں، افسانہ نگار سے یہ نہیں کہتے کہ اس بات کا ثبوت لاؤ کہ گوپی ناتھ نامی کوئی شخص واقعی ہے اور لوگ واقعی اس کو "بابو گوپی ناتھ" کہتے ہیں۔ ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ "بابو گوپی ناتھ" بالکل اصلی شخص ہے۔ اگر ہم اسے نہ مانیں تو افسانہ قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ وجود ہی میں نہیں آ سکتا۔

اس تھوڑی سی اصولی بحث سے میرا مقصد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ داستان امیر حمزہ اگر بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے تو کچھ تعجب کی بات نہیں، بلکہ ایک طرح سے اطمینان کی بات ہے۔ اور اب اس جلد کو ختم کرنے سے پہلے یہ دیکھتے چلیں تو خوب ہوگا کہ اپنی اولین شکل میں اردو کی حد تک یہ داستان کتنی طویل تھی، آئندہ اس میں جو اضافے ہوئے ان کا کوئی اشارہ یا امکان داستان (مختصر) میں ہے کہ نہیں، اور جو کچھ بڑھایا گیا، اور جو کچھ بدلا گیا، اس کے پیچھے منطق کیا تھی۔

ہم اس جلد کے باب سوم میں دیکھ چکے ہیں کہ داستان طویل کے مجموعی صفحات ۴۲۲۸۲ (بیالیس ہزار دو سو بیاسی)، اصل داستان کے صفحات ۴۲۱۲۲ (بیالیس ہزار ایک سو بائیس)، اور اصل

داستان کے الفاظ کم وبیش ۲۴۱۰۶۰۰،۰۲ (دو کروڑ اکتالیس لاکھ چھ ہزار اعشاریہ صفر دو) ہیں۔اب سب سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ اردو میں داستان (مختصر) کے جو تین اولین روپ بنے، ان کے صفحات اور الفاظ کی تعداد کیا تھی۔

## خلیل علی اشک (۱۸۰۱)

مطبوعہ روایت کی حد تک خلیل علی اشک کی داستان (مطبوعہ فورٹ ولیم کالج، ۱۸۰۱) اردو میں داستان امیر حمزہ کی قدیم ترین روایت ہے۔ میرے سامنے اس کے تین نسخے ہیں۔ایک تو دہلی کا مطبوعہ جدید ایڈیشن ہے (،گرگ اینڈ کو پبلشرز، کھاری باولی، دہلی، تاریخ ندارد) جس میں جا بجا تحریف ہے۔یہ تحریف کتاب کے سر ورق سے شروع ہو جاتی ہے، یعنی سر ورق پر ''ہنٹر والی'' قسم کی ایک مسلح عورت کی تصویر (صرف چہرہ) ہے۔دوسرا ممبئی (تب بمبئی) کے مطبع حیدری کا مطبوعہ ہے جس پر جمادی الاولی ۱۲۸۰ [مطابق ۱۸۶۳] کی تاریخ پڑی ہے۔اس کا بھی متن پوری طرح معتبر نظر نہیں آتا۔تیسرا نسخہ مطبع چیون پرکاش دہلی کا مطبوعہ ہے۔اس پر تاریخ درج نہیں، لیکن بعض قرائن ایسے ہیں جن کی روشنی میں اسے نسخۂ ۱۸۶۳ سے قدیم تر قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ایک خاص قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ دہلی کے صفحہ ۱۲ اور صفحہ ۱۹ پر ایک ایک تصویر ہے اور ان تصویروں میں ہاتھ سے رنگ بھرے گئے ہیں۔رنگین طباعت کا یہ طریقہ انیسویں کے اوائل میں ہی رائج تھا۔دونوں نسخوں کی عبارتوں میں کچھ فرق ہے اور مجموعی حیثیت سے نسخہ دہلی کی زبان میں پرانا پن زیادہ ہے۔نمونے کے طور پر میں نسخۂ دہلی اور نسخۂ ممبئی کے شروع کی کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

### نسخۂ دہلی

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے، انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں

اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصے کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک ایک داستان حضور میں سناتے تھے، انعام واکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ ۱۲۱۵ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے، خلیل علی خاں اشک نے جو متخلص باشک ہے، حسب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر نو آموزون زبان ہندی اس قصہ کو زبان اردوے معلیٰ میں لکھا تا کہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔ بمنۃ و کرمہ۔

نسخۂ بمبئی

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے، انھوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں کہیں، واسطے بادشاہ کے سنانے کے۔ اس کے سننے سے آئین ہر طرح کی خلقت کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے، منصوبے لڑائیوں کے، اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے، یاد آتے ہیں۔ اس خاطر ہر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کا درماندہ نہ رہے۔ اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے، مطابق سنہ بارہ سے پندرہ اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے، خلیل علی خاں اشک نے جو متخلص باشک ہے، حسب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے، واسطے نو آموزوں زبان کے ہندی اس قصہ کو زبان میں اردوے معلیٰ کے لکھا تا کہ صاحبان مبتدیون کے پڑھنے کو آسان ہووے۔

مجموعی طور پر میں نے اپنی آسانی کی خاطر دہلوی ایڈیشن کو "اشک ۱۸۰۱" قرار دیا ہے۔ یہ داستان کہنے کو تو چار جلدوں میں ہے لیکن یہ جلدیں بہت مختصر ہیں اور ایک ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ ان کی

مزید تفصیلات حسب ذیل ہیں:

| | |
|---|---|
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۴۳۴ |
| سرورق: | ا صفحہ |
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۴۳۳ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۱۹ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۲۳×۱۹×۴۳۳=۱۸۹۲۲۱ (ایک لاکھ نواسی ہزار دوسو اکیس)

## غالب لکھنوی (۱۸۵۵)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، غالب لکھنوی کا ترجمہ تقریباً ناپید ہے۔ میرے پیش نظر ڈاکٹر پرچٹ (Pritchett) کے دریافت کردہ نسخے کی فوٹو کاپی ہے۔ اس کی کیفیت حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| سرورق: | ا صفحہ |
| خاتمۃ الطبع: | ا صفحہ |
| فہرست مطالب: | ۳ صفحے |
| غلط نامہ: | ۲ صفحے |
| خالی صفحہ: | ا |
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۵۰۰ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۴۹۲ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۱ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۵ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۴۹۲×۲۱×۲۵=۲۵۸۳۰۰ (دو لاکھ

اٹھاون ہزار تین سو )

## عبداللہ بلگرامی (۱۸۷۱)

یہ نولکشور پریس کا اولین ایڈیشن ہے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ کم وبیش پورے کا پورا غالب لکھنوی کا متن ہے جس پر بلگرامی کا نام ڈال دیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن انتہائی کمیاب ہے اور میں اپنے دوست مشرف فاروقی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے برٹش لائبریری سے اس کی نقل مجھے فراہم کی۔ بہر حال، اس کی کیفیت حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| سرورق: | ۱صفحہ |
| کتاب کے مجموعی صفحات: | ۷۵۲ |
| اصل داستان کے صفحات: | ۷۵۱ |
| سطریں فی صفحہ: | ۲۳ |
| اوسط الفاظ فی سطر: | ۲۳ |

اصل داستان کے الفاظ (تقریباً): ۷۵۱×۲۳×۲۳=۳۹۷۲۷۹ (تین لاکھ ستانوے ہزار دوسو اناسی)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب لکھنوی کے یہاں الفاظ کی تعداد اشک سے زیادہ ہے اور غالب لکھنوی نے اشک کے مقابلے میں انہتر ہزار اناسی (۶۹۰۷۹) الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ بلگرامی نے اگر چہ غالب کی نقل کی ہے لیکن جگہ جگہ اپنے الفاظ بے تکلف بڑھائے ہیں ان کی بنا پر بلگرامی کے یہاں الفاظ کی تعداد غالب لکھنوی سے بھی زیادہ ہے اور بلگرامی نے غالب لکھنوی کے مقابلے میں ایک لاکھ اڑتیس ہزار نوسو اناسی (۱۳۸۹۷۹) الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ عبداللہ بلگرامی کے یہاں الفاظ کس طرح بڑھ گئے۔ غالب لکھنوی کا ایک صفحہ میں نے کسی تجویز یا ارادے کے بغیر بے تکلف کھولا ہے:

### غالب لکھنوی (صفحہ ۱۳۹)

جب عمرو نے جانا کہ حکیم نہ جائے گا اور مفت میں تو سزا پائے گا، بزار نالی پیش آیا اور

کہا کہ ”یہ تقریر جو میں نے حضور میں عرض کی، گویا یہ گفتگو صابر و صبور کی زبانی تھی۔ بہتر ہے، آپ نہ جاویں۔ مگر صابر و صبور بھی عجب نسخہ ہیں کہ مجھ کو کالے کوسوں دوڑایا۔ چونکہ شب تار ہے، اس وقت یہاں سے جا نہیں سکتا۔ اگر حکم ہو تو غلام گردش میں غلام پڑ رہے۔“ اقلیمون نے ایک غلام کو حکم دیا کہ اس کو باورچی خانے میں لے جا کر کچھ کھلوا کے رات کی رات سو رہنے دو۔ (کل الفاظ، ۱۰۳)۔

اب اسی متن کو عبداللہ بلگرامی کے یہاں دیکھتے ہیں:

<u>عبداللہ بلگرامی (صفحہ ۲۱۶)</u>

جب عمرو نے جانا کہ حکیم نہ جائے گا اور مفت میں تو سزا پائے گا، بزاروں نالی پیش آیا اور کہنے لگا کہ ”یہ تقریر جو میں نے تصور [کذا، دراصل حضور] میں عرض کی، گویا صابر و صبور کی زبانی تھی۔ بہتر ہے کہ آپ نہ جائیں، مفت تکلیف بے فائدہ نہ اٹھائیں۔ مگر صابر و صبور بھی عجب نسخہ میں [کذا، دراصل، ہیں] کہ مجھ کو کالے کوسوں دوڑایا اور اتنی مسافت دور دراز پر بھجوایا۔ چونکہ شب تار ہے، اس وقت یہاں سے جا نہیں سکتا۔ اور نیا شہر ہے، کوئی راہی بھی رات کو آ نہیں سکتا۔ اگر حکم ہو تو غلام گردش میں غلام پڑ رہے، صبح کو اپنی راہ لے۔ اقلیمون نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس کو باورچی خانے لے جا کر کچھ کھلوا کے رات کو سو رہنے دو۔ کل صبح سویرے یہاں سے روانہ کرو۔ (کل الفاظ، ۱۲۹)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عبارت میں بلگرامی نے اشک کے مقابلے میں تقریباً ستائیس فی صدی زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور نفس مضمون میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ دراصل یہ وہی مضمون ہے کہ ”کہنے سے کہانی بڑھتی ہے۔“ بعد کے ایڈیشنوں میں ممکن ہے کہ ارباب نول کشور پریس نے تجارت کے نقطۂ نظر سے معاملے کو دیکھا ہو کہ داستان کو غیر ضروری طور پر طویل کرنے اور کتاب کی لاگت بڑھانے سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے انھوں نے کتاب کی لاگت کم کرنے کی خاطر داستان کو مختصر کرانا چاہا ہو۔ حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ داستان (طویل) میں بظاہر ایسی کوشش کہیں نظر نہیں

آتی کہ داستان کی ضخامت کم کی جائے، لیکن داستان (طویل) اس وقت کتم مستقبل میں تھی اور ارباب پریس کا شاید کوئی ایسا ارادہ بھی نہ تھا کہ داستان (طویل) کی اشاعت عمل میں لائی جائے۔ بہر حال، داستان (مختصر) کے مطمح نظر سے ہم ایک دو ایڈیشن اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا معاملہ گذرا۔

نول کشور (عبداللہ بلگرامی)، ۱۸۷۱ کے بعد، لیکن قدیم

نول کشور پریس کا ایک قدیم ایڈیشن (ناقص الاول) میرے سامنے ہے۔ اس میں حکیم اقلیمون کے وقوعے کی عبارت (صفحہ ۱۵۸ / ۱۵۹) ہو بہو وہی ہے جو ۱۸۷۱ کے ایڈیشن میں تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس نسخے کی کتابت بہت گٹھی ہوئی ہے۔ یہاں فی صفحہ ۲۵ سطریں ہیں اور فی سطر الفاظ کی اوسط تعداد بھی ۲۵ ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کے صفحات کی تعداد ۷۵۲ سے بہت کم ہوگی۔ زیر نظر نسخے کا آخری صفحہ ۵۵۴ ہے اور اس کی آخری سطر حسب ذیل ہے:

میدان میں اترا۔ اور اس لشکر کے سردار زردہشت کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا تو نام گلرخ تھا اور دوسری کو فرخ کہتے تھے۔

یہ عبارت ۱۸۷۱ ایڈیشن کے صفحہ ۷۴۶ پر ہے، اور کتاب کے کل صفحات، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ۷۵۲ ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ ارباب پریس نے کتاب کی لاگت کم کرنے کے لئے داستان کی طوالت کم نہ کی، بلکہ کتابت اور طباعت میں جز رسی کا زیادہ اہتمام کیا۔ اس طرح انھوں نے کوئی دو سو صفحات کی بچت کر لی لیکن داستان کو بجنسہ رہنے دیا۔ اب دو جدید نسخے بھی دیکھ لیں:

نولکشور (بلگرامی، سید تصدق حسین) اوائل بیسویں صدی

اس نسخے میں بھی (صفحہ ۱۵۸ / ۱۵۹) حکیم اقلیمون کا مندرجہ بالا وقوعہ حرف بہ حرف ویسا ہی بیان ہوا ہے جیسا کہ اوپر کے دو نسخوں میں تھا۔

نول کشور (بلگرامی، سید تصدق حسین، آسی) ۱۹۶۹

اس نسخے کے صفحہ ۱۴۷ پر حکیم اقلیمون کا مندرجہ بالا وقوعہ حرف بہ حرف اب بھی وہی بیان ہوا ہے۔ گویا سو سے دو برس کم (۱۸۷۱ تا ۱۹۶۹) کی مدت میں داستان (مختصر) کے ایڈیشن کثیر تعداد میں نکلے ہوں گے، لیکن جو عبارت ایک بار طویل کر دی گئی تھی وہ مختصر نہ کی گئی۔ اس نسخے میں سر ورق کو چھوڑ

کر کل صفحات ۵۴۳ ہیں۔ مسطر یہاں ۲۵ سطری ہے اور الفاظ کا اوسط فی سطر ۲۴٫۵ ہے۔ اس طرح داستان میں کل الفاظ کی تعداد ۳۳۲۵۸۷٫۵ (تین لاکھ بتیس ہزار پانچ سو ستاسی اعشاریہ پانچ) بیٹھتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۸۷۱ ایڈیشن میں الفاظ کی تعداد ۳۹۷۲۷۹ (تین لاکھ ستانوے ہزار دو سو اناسی) تھی۔ چونسٹھ ہزار چھ سو بانوے الفاظ کا یہ فرق دو باتوں کی وجہ سے ہے۔ ایک تو یہ کہ فارسی آمیز عبارت کم کی گئی ہے، اور دوسری یہ کہ اشعار کم کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، بلگرامی ۱۸۷۱ کے آغاز میں مندرجہ ذیل عبارت ہے:

> واقعہ نگاران رنگیں تحریر، مورخان شیریں تقریر، نوکنندگان افسانہ کہن، یاد دہندگان دیرینہ سخن، یوں بیان کرتے ہیں کہ سرزمین ایران جنت نشان میں ملک مدائن کا ایک شہنشاہ تھا۔ قباد کامران نام، کام دہ مستمندان نا کام، رعیت پروری میں لاجواب، عدالت گستری میں نظیر اس کا نایاب۔

نول کشور، ۱۹۶۹، کا بھی آغاز بجنسہٖ انھیں لفظوں میں ہے۔ لیکن پھر ۱۸۷۱ میں حسب ذیل طویل عبارت ہے جو ۱۹۶۹ میں نہیں ہے:

> عدل گستری اس کے روبرو جور معلوم ہوتا تھا [کذا]۔ فلاح و عیش اس دیار میں بیدار، ظلم و بیداد خواب عدم میں سوتا تھا۔ اس کے ملک میں محتاج و فقیر مثل عنقا بے نشان تھے۔ اغنیا زکوٰۃ دینے کو محتاج، ارباب استحقاق کوئی نہ ملتا تھا [کذا]، حیران تھے۔ اور زبردست و زیر دست یکساں تھے، باز و کنجشک ہم آشیاں تھے۔ چھوٹا بڑا باہم یک دگر دلجوئی کرتا اور ایک دوسرے پر احسان نہ دھرتا تھا۔ دن رات دروازے گھروں کے مثل چشم پاسبان کھلے رہتے تھے کہ دزد حنا تک آسیائے عدالت میں پیسا جاتا تھا۔ چور چوری سے بھی نام چوری کا زبان پر نہ لاتا۔ اگر راہی کچھ راہ میں پڑا پاتا تو ڈھونڈھ کر مالک کو دے جاتا۔ شجاع اور شیر دل و زور آور ایسا کہ رستم بایں شجاعت و توانائی اس کے مقابلے میں مثل پیرزال ناتوان و بزدل گنا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، یہ پوری عبارت ۱۹۶۹ کے ایڈیشن میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس

عبارت کو حذف کر دینا اس غرض سے نہ تھا کہ کتاب کی ضخامت (اور اس طرح اس کی لاگت) گھٹائی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلگرامی، صفحہ ۲۱۶ کی جو عبارت میں نے اوپر نقل کی، اس میں سے، اور اس جیسی دوسری عبارتوں سے وہ فقرے ہٹائے جاتے جنھیں نفس قصہ سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ مندرجہ بالا جملوں کے ہٹائے جانے کا باعث یہی معلوم ہوتا ہے کہ چہرۂ داستان ہی کی فارسی کو کافی و وافی سمجھا گیا اور زیر نظر فارسی آمیز عبارت کو حذف کر دیا گیا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زیر بحث عبارت میں مبالغے اور رنگینی کے وفور کے باعث اسے بھی بمنزلہ شعر قرار دیا گیا ہو۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، ۱۹۶۹ ایڈیشن کا حجم کم ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں شاعری بہت کم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

<u>نولکشوری ۱۸۷۱، شروع کے چھ صفحے:</u>

صفحہ ۵، ایک شعر (سودا)

صفحہ ۵، ایک شعر (صابر بلگرامی)

صفحہ ۶، ایک رباعی (فارسی، شاعر نا معلوم)

صفحہ ۶، ایک شعر (ناسخ)

<u>نولکشوری ۱۹۶۹، شروع کے چھ صفحے:</u>

صفحہ ۵، ایک مصرع (فارسی، رباعی کی بحر میں)

صفحہ ۶ ایک مصرع (اردو، شاعر لا اعلم)

مزید تصدیق کے لئے میں ۱۸۷۱ ایڈیشن کا صفحہ ۱۳۵ بے ارادہ کھولا تو اشعار کی بابت حسب ذیل صورت حال دیکھی:

<u>نولکشوری ۱۸۷۱، صفحہ ۱۳۵ و مابعد:</u>

صفحہ ۱۳۵، ایک شعر (ناسخ)

صفحہ ۱۳۵، ایک شعر (ناسخ)

صفحہ ۱۳۵، ایک شعر (نظیر اکبر آبادی)

صفحہ ۱۳۵، ایک شعر (ناسخ)

صفحہ ۱۳۵، آخری سطر،

تا صفحہ ۱۳۸، دوسری سطر (مسدس کی ہیئت میں ۱۹ بند یعنی ۵۷ اشعار کا واسوخت از نواب بہادر ذکی)

صفحہ ۱۳۸، ایک شعر (مترجم داستان [یعنی غالب لکھنوی، ملاحظہ ہو، غالب لکھنوی، صفحہ ۹۰])

نولکشور پریس کے ۱۹۶۹ ایڈیشن میں ۱۸۷۱ ایڈیشن، صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۸ کی متبادل عبارت صفحہ ۹۸ تا ۹۹ پر دیکھی گئی تو حسب ذیل حال ظاہر ہوا:

<u>نولکشوری، ۱۹۶۹، صفحہ ۹۸:</u>

صفحہ ۹۸، ایک شعر (نظیر اکبر آبادی)

دونوں روایتوں (نولکشوری ۱۸۷۱، اور نولکشوری ۱۹۶۹) میں یہ وقوعہ مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

آپ درخت پر چڑھ گئے، بام قصر پر پہنچ گئے۔

(نولکشوری ۱۸۷۱، ص ۱۳۸، نولکشوری ۱۹۶۹، ص ۹۹)

لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ نفس داستان سے ایک بھی حرف ۱۹۶۹ والے ایڈیشن میں گھٹایا نہیں گیا ہے۔ کمی صرف اشعار، اور بھاری، فارسی آمیز عبارتوں میں کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ زبانی بیانیہ اگر لکھا بھی جائے تو بھی اس کا رجحان افزائش ہی کی طرف ہوتا ہے، تخفیف کی طرف نہیں۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ کسی مطبوعہ افسانے کو کاغذ پر نقل کرنا چاہیں گے تو اسے ہو بہو پورا پورا نقل کریں گے، کچھ بڑھائیں گے نہ گھٹائیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی سے کوئی قصہ سنیں اور پھر اسے کاغذ پر مکمل لکھنے کی کوشش کریں تو آپ کا تحریری متن بلاشبہ زبانی بیانیے سے کچھ مختلف ہوگا اور اغلب ہے کہ اصل کے مقابلے میں کچھ طویل بھی ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے "زیب داستان" کہا جاتا ہے، کہ بڑھا بھی دیتے ہیں

کچھ زیب داستاں کے لئے۔ یعنی زبانی بیان کرتے وقت خواہ مخواہ کچھ زیادہ تفصیل میں جانے جی چاہتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ زبانی سنی ہوئی داستان/کہانی میں معنی اور تاثر کا بہت کچھ حصہ بیان کنندہ کے حرکات وسکنات، جسمانی اشاروں، لہجے کے اتار چڑھاؤ، آواز کی بلندی اور پستی، بیان کنندہ کے چہرے پر آتے جاتے تاثرات، وغیرہ کا ہوتا ہے۔ تحریر ان باتوں سے خالی ہوتی ہے، اس لئے زبانی بیانیہ کو تحریر میں منتقل کرتے وقت ہم غیر شعوری طور پر ان عناصر کی کمی پوری کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جو زبانی بیانیہ میں ہم نے محسوس کی تھیں لیکن تحریر میں نہیں آسکتیں۔ احمد حسین قمر نے پتے کی بات کہی تھی (''طلسم ہوش ربا''، ہفتم، ۵۱۹) کہ داستان یوں لکھی جانی چاہیئے ؏ کہ تحریر میں لطف تقریر ہو۔ اب بھلا یہ لطف کیسے پیدا کیا جائے بجز اس کے کہ جو چیز تقریر میں ہوتی ہے اور تحریر میں ناممکن ہے اس کے بدلے کچھ اس کی طرح کی، خواہ دور سے ملتی جلتی چیز تحریر میں داخل کر دی جائے۔

زبانی بیانیہ اس لئے بھی بڑھنے کا رجحان رکھتا ہے کہ اس میں کسی روایت کو دوام نہیں۔ ہر روایت کی تفصیلات اور جزئیات ہر بیان کے ساتھ بدل سکتی ہیں۔ راجستھان کے زبانی (منظوم) داستان گویوں کا دعویٰ ہے کہ جو داستان وہ سناتے ہیں (راجا گوپی چند اور راجا بھرتھری کی گاتھائیں) وہ انھیں زبانی یاد ہوتی ہیں۔ لیکن تجربہ کر کے دیکھا گیا (یعنی ایک ہی داستان گو کی داستان دو بار سنی گئی اور دونوں بار ٹیپ ریکارڈ کی گئی) تو پتہ لگا کہ دونوں بیانوں میں ذرا ذرا سے، لیکن صاف نظر آنے والے فرق موجود ہیں۔

داستان میں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وقوعے کی کئی روایتیں ہوں اور وہ سب یکجا بیان کر دی جائیں۔ داستان گو ایک روایت بیان کر کے بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ''اور یوں بھی کہا گیا ہے'' اور دوسری روایت بیان کر دیتا ہے۔ یا ایک وقوعہ بیان کر کے وہ کہتا ہے کہ ''بعض نے یوں نہیں یوں کہا ہے۔'' اس طرح کے ''تضادات'' کی سب سے نمایاں مثالیں داستان (مختصر) کی ابتدا یا اجرا کے بارے میں روایات، اور داستان کے اہم ترین کردار امیر حمزہ کی موت کے بارے میں روایات میں ملتی ہیں۔ ہم یہاں داستان کی ابتدا کے بارے میں چند روایتوں سے بحث کریں گے:

<u>قصۂ حمزہ، مخطوطہ مرتبہ جعفر شعار (۱۹۶۹)، صفحہ ۳ تا ۴</u>

ایں قصہ ایست معروف و مشہور در عرب و عجم و در کل بلاد اسلام بہ روایات مختلف، اما ایں

قصہ بروایت صحیح از امیر المومنین عباس رضی اللہ عنہ، ابو طالب و عباس اودران حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ...رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایں قصہ را از ابن عباس پرسیدے، رضی اللہ عنہ، چنانچہ شاعر گوید، نظم:

محمد کہ بد معلن کاف و نوں
چو دلتنگ گشتے بکار اندروں
[بہ عباس گفتے کہ اے نیک خو]
کہ فصلے [باخبار عمم] بگو
چو عباس گفتے مرا [یں] سرگذشت
کہ بر حمزہ دور فلک چوں گذشت
چہ کرد او بآں جان نوشیرواں
ز رزم عراق و بہ مازندراں
چو سقلان رومی ویا سیقلاں
ہمہ بندہ گشتند شاں پر دلاں
بہ یونان و یا قارن دیو بند
فگندہ بہ خاکش یل ہوشمند
بہ ایراں زمیں شد یکے نیک نام
ہرون دلاور بہ کشتی غلام
مرایں را کہ بشنود ہر کس رواست
کہ در سر اخبار ایزد گواست
کہ در کارہائش عجائب بسے است
کہ ایں [قصہ خود عبرت ہر کسے است]
محمد رسول است نزد اللہ

نماید ترارہ سوے بارگاہ

برادر ورا چار یار گزیں

ہمہ خوب و پاکیزہ رائے و متیں

روایت کند عم پاکیزہ دیں

بہ پیش نبی سید المرسلیں

ز اخبار حمزہ عم مصطفیٰ

امیر شہیداں بروز قضا

کہ گوینده گفته است تا بوده ایم

ازیں تحفہ قصہ نشو دہ ایم (۱)

ازخواندن وشنیدن ایں قصہ فوائد بسیار است انشاء اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ:

یہ قصہ عرب اور عجم اور کل بلاد اسلام میں بروایات مختلف مشہور ومعروف ہے۔ لیکن صحیح روایت کی رو سے یہ قصہ امیر المومنین عباس رضی اللہ عنہ، ابوطالب وعباس، جو حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے...رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قصے کو ابن عباس سے سنتے تھے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے، نظم:

محمد، جو کہ حرف کن کے ظاہر ہونے کا باعث تھے، جب کاموں سے دلتنگ ہو جاتے تو عباس سے کہتے کہ "اے نیک خو، میرے چچا کے حالات میں سے کوئی حصہ بیان کرو۔" عباس اس سر گذشت کو بیان کرتے کہ حمزہ پر دور فلک کیونکر گذرا۔ [سنو کہ] انھوں نے نوشیرواں کی جان کے ساتھ کیا کیا، اور روم اور عراق اور مازندران کی جنگ کے بارے میں [سنو]۔ سقلان رومی ہوں یا سقلان، انھوں نے بہت سے بہادروں کو اپنا غلام

بنایا، یونان کی سرزمین میں۔ اور اس ہوش مند پہلوان نے قارن
دیو بند کو زمین پر لا پھینکا۔ ایران کی سرزمین میں وہ نیک نامی
میں یکتا تھے۔ ہرون جیسے دلاور کو انھوں نے کشتی لڑ کر غلام بنالیا
تھا۔ ہر شخص اس قصے کو سنے تو روا ہے، کیونکہ یہ اسرار ایزدی کی
باتوں پر شاہد ہے۔ اس کے کاموں میں عجائب بہت ہیں، اور یہ
قصہ ہر شخص کے لئے سامان عبرت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر
میں محمد رسول ہیں اور وہ تمھیں بارگاہ (ایزدی) کی راہ دکھاتے
ہیں۔ ان کے چار برگزیدہ یاران کے بھائی (کی طرح) تھے،
سب نہایت نیک اور پاکیزہ رائے رکھنے والے اور متین
تھے۔ پاکیزہ دین رکھنے والے چچا [حضرت عباس] نبی سید
المرسلین کے حضور میں حمزہ عم مصطفٰے کے واقعات سناتے ہیں،
امیر حمزہ، جو روز حشر میں تمام شہیدوں کے امیر ہوں گے۔
کہنے والا کہتا ہے کہ ہم نے ساری زندگی میں اس سے بہتر قصہ
نہیں سنا۔

اس قصے کو پڑھنے اور سننے سے بہت فوائد ہوں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

رموز حمزہ (بمبئی ۱۹۰۹)، صفحہ ۲ تا ۳

داستان امیر حمزۂ صاحب قران قصہ ایست معروف و مشہور در عرب و عجم، بروایات مختلفہ۔ واما اصح روایات آنست کہ از عباس رضی اللہ عنہ سیدہ است کہ او برادر بزرگ حمزہ بود، و ہمیشہ ہمہ جا ہمراہش بود۔ و حمزۂ صاحب قراں و عباس رضی اللہ عنہ و ابو طالب او دران حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم بودند۔ حضرت رسالت ہر گاہ کہ دل تنگ می شدند ایں قصہ را از عباس می پرسیدند۔ نظم:

محمد کہ بد باعث کاف ونوں

چو دلتنگ گشتے ز دنیاے دوں

بہ عباس گفتے کہ اے نیک خو

کہ فصلے ز اخبار عمم بگو

چنیں گفت عباس ایں سرگذشت

کہ بر حمزہ دور فلک چوں گذشت

کنوں بشنواے مومن پاک دیں

حکایاتے از حمزۂ بے قریں

گہے شیر نر را بکندے دو گوش

ز گرزش ہمی فیل کردے خروش

ز دیو سفیدش نبودے ہراس

ہراساں ازو بود ہر نا سپاس

چہا کرد بر جان نوشیرواں

ز روم و عراق و ز مازندراں

چہا کرد بر جان شداد دیں

ز تیغش مکاں ساخت خاک زمیں

چہ سقلان رومی و یا اسقلاں

بسے کشت و بربست از پردلاں

بہ یوناں زمیں قارن دیو بند

بخاکش فگند آں یل ارجمند

ز دارا و قیصر ز فغفور چیں

خراجش ببردے بایراں زمیں

بایں ایراں زمیں شد کسے نیک نام
کہ گشت از دل و جاں مر او را غلام
چو حمزہ نبود و نباشد کسے
کہ مردی و ہمت بد او را بسے
مرایں قصہ زیں ساں شنیدن رواست
کہ در سر اخبار ایزد گواست
کہ در کار ہایش عجائب بسے ست
کہ ایں قصہ خود عبرت ہر کسے ست

و بروایتے، آنکہ چوں در زمان دولت بنی امیہ، اعلام کفر و شقاوت، ولوائے ظلم و عداوت نسبت باہل بیت رسالت بلند شد، و خلائق از جادۂ متابعت و محبت خاندان نبوت بہ بیابان ضلالت و تیہ گمراہی و غوایت در آمدند، و جمہور امت و عامۂ ناس و عام و خاص از بلاد و امصار عرب و عجم روے بدرگاہ معاویہ نہادند و تقرب او جستند، و بدوستی او فخر و مباہات می کردند، و چوں معاویہ بر خلق جہاں استیلا یافت، امر نمود کہ امیر المومنین علیہ السلام و اہل بیت او را دشنام دہند و افترا بر ایشاں بندند۔ لاجرم از عرب و عجم و ترک و دیلم او امر و نواہی او را مطیع و منقاد شدند۔ و بروس منابر ہر صبح و شام سب و شتم آں حضرت و اہل بیت او را می نمودند۔ و ایں بدعت شنیع ہزار ماہ درمیان مردم ماند۔ ملا علی و ملا حسین نام، کہ دانشمندان آں زماں بودند، از دوستان اہل بیت، با جمعے دیگر از دانایان ایں داستان را از کتب سیر و تواریخ وضع و جمع کردند، و کتابے ساختند۔ و در بازار ہا و قہوہ خانہ ہا بر مردم می خواندند۔ و عوام الناس چوں ایں قصہ را شنیدند، رغبت کردند، و قدرے از ذکر و فکر و تبرائے اہل بیت افتادند۔

ترجمہ:

داستان امیر حمزۂ صاحب قراں، عرب و عجم میں مشہور قصہ ہے اور اس قصے کی بہت

سی روایتیں ہیں۔ لیکن صحیح ترین وہ ہے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ آپ بڑے بھائی تھے جناب حمزہ کے، اور ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اور حمزۂ صاحب قراں، اور عباس رضی اللہ عنہما، اور ابو طالب، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کے بھائی تھے۔ اور حضرت رسالت جب کبھی دلتنگ ہوتے تو اس قصے کو حضرت عباس سے سنتے تھے۔ نظم:

محمد، جو کہ حرف کن کا باعث تھے، جب دنیاے دوں سے دلتنگ
ہو جاتے تو عباس سے کہتے کہ "اے نیک خو، میرے چچا کے
حالات میں سے کوئی حصہ بیان کرو۔" عباس اس سرگذشت کو
بیان کرتے کہ حمزہ پر دور فلک کیونکر گذرا۔ اس لئے اے مومن
پاک دیں، اب تم بھی حمزہ بارے میں، کہ ان کا کوئی ثانی نہ تھا
کچھ حکایات سنو۔ کبھی وہ شیر نر کے دونوں کان اکھاڑ دیتے، کبھی
ہاتھی ان کے گرز [کی ضرب] سے چیخ اٹھتا۔ انھیں دیو سفید سے
کوئی خوف نہ تھا اور تمام ناشکرے لوگ ان سے خوف کھاتے
تھے۔ [سنو کہ] انھوں نے نوشیرواں کی جان کے ساتھ کیا کیا،
اور روم اور عراق اور مازندران کے بارے میں [سنو]۔ دین پر
ظلم کرنے والے کی جان کے ساتھ انھوں نے کیا کیا۔ انھوں
نے اس کی تخت گاہ کو برابر خاک کر دیا۔ سقلان رومی ہوں یا
اسقلان، انھوں نے بہت سے بہادروں کو قتل یا بستۂ رسن
کیا۔ یونان کی سرزمین میں اس سربلند پہلوان نے قارن دیو بند
کو زمین پر لا پھینکا۔ وہ دارا، اور قیصر، اور فغفور چین سے خراج
وصول کر کے ایران میں لاتے۔ ایران کی سرزمین پر جو بھی نیک
نام تھا، وہ دل و جان سے انھیں کا غلام تھا۔ حمزہ کی طرح کا کوئی نہ

تھا اور نہ ہوگا، کیونکہ ان میں مردانگی اور ہمت بہت تھی۔ اس قصے
کو اس طرح سننا درست ہے کہ یہ اسرار ایزدی کی باتوں پر شاہد
ہے۔ اس کے کاموں میں عجائب بہت ہیں، اور یہ قصہ ہر شخص
کے لئے سامان عبرت بھی رکھتا ہے۔

اور ایک روایت یہ ہے کہ جب امویوں کے دور حکومت میں اعلام کفر و شقاوت، اہل بیت رسالت کے خلاف ظلم اور عداوت کے جھنڈے بلند ہوئے، تو خاندان نبوت کی محبت اور ان کی متابعت کا جادہ چھوڑ کر خلقت بیابان ضلالت اور گمراہی وفریب کے دشت میں جا رہی، اور عرب اور عجم کے شہروں اور علاقوں سے تمام امت اور عامۃ الناس خاص و عام نے درگاہ [امیر] معاویہ کا رخ کیا اور ان سے تقرب کے متلاشی ہوئے اور ان کی دوستی اور محبت پر فخر و مباہات کرنے لگے۔ اور جب [امیر] معاویہ کو خلق دنیا پر استیلا حال ہو گیا تو انھوں نے حکم دیا کہ امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کو گالیاں دی جائیں اور ان پر افترا باندھے جائیں۔ بے شک عرب اور عجم اور ترکی اور دیلم کے لوگ ان کے احکام کے مطیع اور منقاد ہو گئے، اور بر سر منبر ہر صبح آنحضرت اور ان کے اہل بیت کو سب و شتم کرنے لگے۔ اور یہ فعل شنیع ایک ہزار مہینے تک انسانوں میں [رائج] رہا۔ تو ملا علی اور ملا حسین نام کے دو صاحبان، جو اس زمانے کے مرد دانش مند اور دوستان اہل بیت تھے، انھوں نے اور کچھ داناؤں کے ساتھ مل کر اس داستان کو کتب سیر و تواریخ سے وضع اور جمع کیا اور ایک کتاب بنا ڈالی۔ اور وہ اسے بازاروں اور قہوہ خانوں میں لوگوں کے سامنے سناتے۔ جب عوام الناس نے اس قصے کو سنا، ان کو اس میں رغبت ہوئی اور وہ ذکر و فکر و تبرائے اہل بیت سے تھوڑا رکنے لگے۔

زبدۃ الرموز (۱۶۱۳)، ورق ا، صفحہ ۲

بعد از شہادت یافتن شیر بیشۂ ہیجا، بعضے از اوقات سرور کائنات چوں از خانۂ عم بزرگوار

خود گذشتے، بعضے از عظمائے خواتین عرب کہ دراں حوالی مقیم بودند دائم بہ زبان حال غزوات و مردانگی ہائے آں سرور اہل ہیجا را یاد کردہ نوحہ می کردند۔ تا باستماع ایں کلمات سید ابرار در آں موضع توقف را مجال صواب می دیدند۔ و راوی ایں امر غریب عمر [کذا] بن امیہ زمری [کذا] ست کہ از ارباب ندما و اصحاب ظرفا است۔ مدتے ایں در گراں مایہ در عرب مخفی و مستور بود تا زمانے کہ مولانا مسعود مکی، کہ یکے از فصحائے عرب بود، سر رشتۂ ایں کلمات متین بدست او افتادہ، مشار الیہ چیزے چند برآں افزود۔ و در آں زماں، مردم بہ ناسزائے حضرات قیام می نمودند۔ چوں آنجناب ایں حال مشاہدہ نمود رائے پسندیدۂ او برآں قرار یافت کہ ہر روز مجلسے ازیں حکایت از جہت عوام بگذرانند تا شاید از آں امر شنیع باز آیند۔ و اکثر اوقات مردم را بدرم، و متانت سخن، و لطف، و خلق پسندیدہ فریفتۂ خود گردانیدے، تا رغبت بہ شنیدن ایں حکایت نمودند و از ناسزا گفتن فراموش کردند... و بعضے برآنند کہ از خلفائے بنی عباس یکے را مرض سرسام بہم رسید و ہیچ وجہ رفع آں نمی شد۔ جمعے بتصنیف ایں کتاب مشغول شدند و ایشاں... کہ از عظمائے حکمائے خلفائے بنی عباس بودند، ایں حکایت را وضع کردند۔ و جمعے از ایشاں در خدمت آں شہریار ذوی الاقتدار شب و روز در خواندن جدو جہد باظہار رسانیدند، تا آں صاحب سعادت را از آں مرض شفا شد... و اکثر اہل فن برآنند کہ واضع ایں افسانۂ غریب بزبان فرس مولانا ابو المعالی نیشاپوری و ملا جلال بلخی کہ سر آمد استادان روزگار اند، و دریں علم مہارت تمام داشتہ اند ایں را بلباس ہستی مزین گردانیدہ اند۔ و مولانا سلطان حسین مشتاقی کہ یکے از اکابر قصہ خوانانست، از اول قصہ تا گرفتن ایرج، از او بصحت پیوست۔

ترجمہ:

شیر بیشۂ جنگ [امیر حمزہ] کی شہادت کے بعد جب سرور کائنات اپنے چچا کے گھر سے کبھی کبھی گذرتے تو عرب کی خواتین عظمی جو وہاں مقیم تھیں، ہمیشہ زبان حال سے ان

سرور جدال [امیر حمزہ] کے غزوات اور ان کی مردانگیوں کو یاد کر کے نوحہ کرتی تھیں۔
اور ان کلمات کو سن کر سید ابرار کبھی کبھی وہاں ٹھہرنا مناسب گردانتے تھے۔ اور اس انوکھی بات کے راوی عمر [کذا] بن امیہ زمری [کذا] ہیں جو ارباب ندما و اصحاب ظرفا میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک یہ قیمتی موتی ملک عرب میں مخفی و مستور تھا۔ جب مولانا مسعود مکی، کہ یکے از فصحائے عرب تھے، کے ہاتھ سر رشتۂ ان کلمات متین کا آیا، مشار الیہ نے اس میں کچھ اضافہ کیا۔ اور اس زمانے میں لوگ، حضرات [صحابہ؟ اہل بیت؟] کے خلاف نامناسبات پر قائم تھے۔ جب آنجناب نے اس حال کا مشاہدہ کیا تو ان کی رائے پسندیدہ میں یہ ٹھہری کہ ہر روز لوگوں کے سامنے اس قصے میں سے مجملاً کچھ پیش کریں، کہ شاید اس طرح عوام اس امر شنیع سے باز آجائیں۔ اور وہ اکثر اوقات لوگوں کو روپے پیسے سے، اور متانت سخن سے، اور لطف، اور اخلاق پسندیدہ سے اپنا فریفتہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو اس حکایت کے سننے کی طرف رغبت ہوئی اور انھوں نے ناسزا باتیں کرنا فراموش کر دیں... اور بعض کا خیال ہے کہ خلفائے بنی عباس میں سے ایک کو مرض سرسام لاحق ہوا۔ کسی بھی ترکیب سے اس کا دفعیہ نہ ہوتا تھا۔ تب لوگوں کا ایک گروہ اس کتاب کی تصنیف میں مشغول ہوا۔ اور ان لوگوں نے، جو کہ... عظمائے حکمائے خلفائے بنی عباس تھے، یہ حکایت وضع کی۔ اور ان میں سے کچھ لوگ اس شہریار ذی اقتدار کی خدمت میں شب و روز اس کو پڑھتے اور اس جد و جہد کا بیان کرتے رہے، حتیٰ کہ اس صاحب سعادت کو اس مرض سے شفا ہوئی... اور اکثر اہل فن کا کہنا ہے کہ اس افسانۂ غریب کو زبان فرس میں مولانا ابوالمعالی نیشاپوری و ملا جلال بلخی نے، جو کہ سرآمد استادان روزگار ہیں اور اس علم میں مہارت تمام رکھتے ہیں، انھوں نے اس افسانے کو بلباس ہستی مزین کیا، اور مولانا سلطان حسین مشتاقی جو کہ اکابر قصہ خوانوں میں سے ایک ہیں، انھوں نے اول قصہ سے لے کر ایرج کی گرفتاری تک اس قصے کی تصحیح کی۔

منقولہ بالا عبارتوں میں سے کچھ کو ہم اس کتاب کی جلد اول میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں انھیں دوبارہ پیش کرنے اور پوری تفصیل کے ساتھ نقل کرنے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ داستان (مختصر) شروع ہی سے اس طرح بیان کی گئی تھی کہ اس میں آئندہ اضافوں کی گنجائش اور ان اضافوں کی جہت اور نوعیت کی طرف اشارے موجود تھے۔ مندرجہ ذیل پر غور کریں:

''قصہ حمزہ'' میں داستان کی ابتدا کے بارے میں صرف ایک روایت ہے۔ اس کی مختصر تفصیل نیچے دی جاتی ہے:

''قصہ حمزہ'': ایک روایت

صحیح روایت وہ ہے جو امیر المومنین عباس رضی اللہ عنہ، ابو طالب و عباس، جو حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، ان سے ہم تک پہنچی ہے... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قصے کو ابن عباس سے سنتے تھے۔

''رموز حمزہ'': دو روایتیں:

''رموز حمزہ'' میں ایک کی جگہ دو روایتیں درج ہوئی ہیں اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) صحیح ترین وہ ہے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ آپ بڑے بھائی تھے جناب حمزہ کے، اور ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اور حمزہ صاحب قراں، اور عباس رضی اللہ عنہما، اور ابو طالب، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کے بھائی تھے۔ اور حضرت رسالت جب کبھی دلتنگ ہوتے تو اس قصے کو حضرت عباس سے سنتے تھے۔

(۲) اور ایک روایت یہ ہے کہ جب امویوں کے دور حکومت میں [امیر] معاویہ کو خلق دنیا پر استیلا حاصل ہو گیا تو انھوں نے حکم دیا کہ امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کو گالیاں دی جائیں... یہ فعل شنیع ایک ہزار مہینے تک انسانوں

میں [رائج] رہا۔ تو ملا علی اور ملا حسین نام کے دو صاحبان، جو اس زمانے کے مرد دانش مند اور دوستان اہل بیت تھے، انھوں نے اور کچھ داناؤں کے ساتھ مل کر اس داستان کو کتب سیر و تواریخ سے وضع اور جمع کیا اور ایک کتاب بنا ڈالی۔ اور وہ اسے بازاروں اور قہوہ خانوں میں لوگوں کے سامنے سناتے۔ جب عوام الناس نے اس قصے کو سنا، ان کو اس میں رغبت ہوئی اور وہ ذکر و فکر و تبرائے اہل بیت سے تھوڑا رکنے لگے۔

''زبدۃ الرموز'' میں پیغمبر اسلام اور ان کے عمین شریفین کے بارے میں روایت موجود تو ہے لیکن اس کی شکل بالکل بدلی ہوئی ہے۔ اب یہ داستان امیر حمزہ کے گھر کی عورتوں کے بیانات، ماتم، بین اور ندبہ پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ، ''زبدۃ الرموز'' میں اور بھی روایات ہیں:

''زبدۃ الرموز'': چار روایتیں:

(۱) شیر بیشۂ جنگ [امیر حمزہ] کی شہادت کے بعد جب سرور کائنات اپنے چچا کے گھر سے کبھی کبھی گذرتے تو عرب کی خواتین عظمیٰ جو وہاں مقیم تھیں، ہمیشہ زبان حال سے ان سرور جدال [امیر حمزہ] کے غزوات اور ان کی مردانگیوں کو یاد کر کے نوحہ کرتی تھیں۔ اور ان کلمات کو سن کر سید ابرار کبھی کبھی وہاں ٹھہرنا مناسب گردانتے تھے۔

(۲) مولانا مسعود مکی، کہ یکے از فصحائے عرب تھے، کے ہاتھ سررشتۂ ان کلمات متین کا آیا، مشارٌالیہ نے اس میں کچھ اضافہ کیا۔ اور اس زمانے میں لوگ، حضرات [صحابہ؟ اہل بیت؟] کے خلاف نا مناسبات پر قائم تھے۔ جب آنجناب نے اس حال کا مشاہدہ کیا تو ان کی رائے پسندیدہ میں یہ ٹھہری کہ ہر روز لوگوں کے سامنے اس قصے میں سے مجملاً کچھ پیش کریں، کہ شاید اس طرح عوام اس امر شنیع سے باز آ جائیں۔

(۳) خلفائے بنی عباس میں سے ایک کو مرض سرسام لاحق ہوا۔ کسی بھی ترکیب سے اس کا دفعیہ نہ ہوتا تھا۔ تب لوگوں کا ایک گروہ اس کتاب کی تصنیف میں مشغول ہوا۔

اوران لوگوں نے ، جو کہ ... عظمائے حکمائے خلفائے بنی عباس تھے، یہ حکایت وضع کی۔ اوران میں سے کچھ لوگ اس شہر یار ذی اقتدار کی خدمت میں شب و روز اس کو پڑھتے اور اس جد و جہد کا بیان کرتے رہے، حتیٰ کہ اس صاحب سعادت کو اس مرض سے شفا ہوئی۔

(۴) اکثر اہل فن کا کہنا ہے کہ اس افسانۂ غریب کو زبان فرس میں مولانا ابوالمعالی نیشا پوری وملا جلال بلخی نے، جو کہ سرآمد استادان روزگار ہیں اور اس علم میں مہارت تمام رکھتے ہیں، انھوں نے اس افسانے کو بلباس ہستی مزین کیا۔

یہاں پہلی بات تو یہ دیکھنے کی ہے کہ ''قصۂ حمزہ'' اور ''زبدۃ الرموز'' میں کوئی سات سو برس کا فصل ہے۔ اس مدت میں داستان کے آغاز و ابتدا کے بارے میں کئی روایات بنیں جو کئی پہلوؤں سے ایک دوسری سے متغائر ہیں اور ان کا ارتقا مذہبی میدان سے ہٹتا ہوا نامذہبی (secular) میدان کی طرف راجع ہوتا گیا ہے۔ اور مذہبی میدان میں بھی اس کے ارتقا کی نوعیت یہ رہی ہے کہ پہلی روایت میں مسلمانوں کے کسی فرقے کو اس کی برائی یا بھلائی کرنے کی غرض سے پیش منظر میں نہیں ڈالا گیا تھا۔ امیر حمزہ کی شہادت، اس شہادت پر عورتوں کے بین، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان، کہ یہ بین سنے جائیں، یہ باتیں کسی فرقے کے خلاف یا موافق نہیں ہیں، بلکہ سب کے لئے قابل قبول ہیں۔ ''رموز'' میں یہ روایت دوسری بار سامنے آتی ہے اور بہت کچھ بدلی ہوئی ہے، لیکن اس میں ابھی کسی فرقہ واریت کا پتہ نہیں، بلکہ یہ روایت حضرت رسالت کو ذرا اور زیادہ پیش منظر میں لاتی ہے۔

''زبدۃ الرموز'' کی پہلی روایت میں امیر حمزہ کی شہادت پر شیون و ماتم کا پہلو نمایاں ہے، بلکہ یہی ایک پہلو اس میں نمایاں ہے۔ مذہبی فرقہ واریت کا یہاں بھی پتہ نہیں، بجز اس کے کہ ماتم وشیون کی رسوم شیعی حضرات کے یہاں زیادہ رائج ہیں لہٰذا اس روایت میں تھوڑا سا شیعی رنگ کہا جا سکتا ہے۔ ''رموز حمزہ'' کی دوسری روایت کھلے طور پر بنی امیہ کے خلاف اور حضرات شیعہ کے اس عام عقیدے کے موافق ہے کہ اموی دور میں اہل بیت پر کھلے بندوں سب و شتم ہوتا تھا اور یہ فعل شنیع عباسیوں کے بھی عہد میں عام رہا۔ تاریخی طور پر یہ روایت اس لئے دلچسپ ہے کہ اس کو صحیح ماننے والوں کی نظر میں داستان امیر حمزہ کے

آغاز و ابتدا کا زمانہ، اختتام دور بنو امیہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ امیر معاویہ کے مبینہ ''حکم'' کی پابندی ایک ہزار مہینوں، یعنی کوئی تراسی (۸۳) سال تک ہوتی رہی۔ چونکہ بنو امیہ کی مدت حکومت بانوے (۹۲) برس ہے، لہٰذا ملا علی اور ملا حسین نے بنو امیہ کے آخری زمانوں میں اس داستان کو وضع اور مرتب کیا ہوگا۔ اس کے برخلاف، ''زبدۃ الرموز'' کی دوسری روایت میں بنی امیہ یا بنی عباس کا نام لئے بغیر ذرا سا اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک زمانے میں لوگ اصحاب اہل بیت، یا اصحاب نبیؐ پر تبرا کی طرف مائل تھے۔ یعنی یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے کہ روایت کے رجحان کو نہ شیعہ فرقہ کی طرف رکھا ہے نہ سنی فرقہ کی طرف۔ لیکن واضع قصہ کا نام ملا علی اور حسین کے بجائے (جنھیں ''رموز حمزہ'' کی روایت دوم میں ''دوستان اہل بیت'' کہا گیا ہے) مولانا مسعود مکی بتایا گیا ہے اور ان کی تعریف ''دوست اہل بیت'' کی جگہ ''یکے از فصحائے عرب'' بتائی گئی ہے، یعنی روایت کے ارتقا کا رجحان یہاں بھی مذہب کے بجائے داستان گوئی کی طرف ہے۔

''زبدۃ الرموز'' کی تیسری روایت میں مذہب کا عنصر بالکل نہیں (بلکہ تھوڑی بہت توہم پرستی کا اشارہ ضرور ہے)۔ لیکن اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ اس روایت کی رو سے داستان میں شفادہندگی کی صفت ہے۔ یعنی اس داستان میں کوئی معیوب یا مخرب الاخلاق بات نہیں۔ اور اس نکتے کو داستان، یا زبانی بیانیے کی پوری شعریات کا اہم نکتہ کہہ سکتے ہیں کہ داستان میں قوت شفا ہوتی ہے اور یہ زندگی کی قوتوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ایک مزید نکتہ یہ ہے کہ داستان کی ابتدا کو اب ایک جانے پہچانے تاریخی زمانے سے منسلک کردیا گیا ہے۔ اور اس کی توثیق اگلی روایت سے ہوتی ہے کہ اس داستان کو فلاں فلاں صاحبان نے زبان فارسی میں منتقل کیا۔

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ داستان اپنی اصل ہی کے اعتبار سے بڑھتے رہنے کا رجحان رکھتی ہے اور اس کی ابتدا کے بارے میں مختلف اور کبھی کبھی متغائر روایات بھی یہی ثابت کرتی ہیں کہ قصے کو جس طرف چاہیں اور جتنا چاہیں پھیلا سکتے ہیں۔

یہاں ایک دلچسپ بات اور بھی ہے: ''قصۂ حمزہ'' اور ''رموز حمزہ'' دونوں کے آغاز میں ایک مثنوی ہے جس میں آغاز داستان کے علاوہ کچھ واقعات داستان بھی بتائے گئے ہیں۔ ''قصۂ حمزہ'' میں جن

واقعات کا ذکر ہے، ان میں سے حسب ذیل ایسے ہیں جن کا داستان (مختصر) میں کوئی ذکر نہیں۔ اور داستان (مختصر) ہی کیا، داستان (طویل) میں بھی کوئی ذکر نہیں:

- رزم عراق و مازندراں؛ سقلان رومی و یا سیقلاں؛ ہرون دلاور۔

''رموز حمزہ'' میں یہ فہرست اور لمبی ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل مزید ناموں/واقعات کا ذکر داستان (طویل یا مختصر) میں نہیں ہے:

[امیر حمزہ کا] شیر نر کے کان اکھاڑنا؛ [امیر حمزہ کے] گرز کی مار سے فیل کا چیخ پڑنا؛ ملک روم میں [امیر حمزہ] کی جنگیں؛ اور شداد دیں [اگر یہ کوئی نام ہے، ورنہ کسی دشمن دیں جابر بادشاہ] کی تخت گاہ کو خاک میں ملا دینا؛ دارا اور قیصر [روم] اور فغفور چیں سے خراج وصول کر کے ایران کو لانا۔

دوسرے الفاظ میں، داستان (مختصر) کی ابتدا کے بارے میں جو داستانی روایتیں ہیں، ان میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ہے جو اپنی جگہ پر خود ایک داستان بن سکتے تھے، اور عجب نہیں کہ بعض زبانی روایتوں میں ان واقعات کو مفصلاً مذکور بھی کیا گیا ہو۔ لیکن بنیادی نکتہ یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کون سی داستانیں کبھی معرض بیان میں آئیں یا نہیں۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ داستان (مختصر) ہی میں ایسے امکانات موجود ہیں جنھیں وسعت دیں تو داستان بڑھنے اور پھیلنے لگ جائے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں کہ جن واقعات کی طرف اشارے کئے گئے وہ کبھی داستان کا حصہ بنے کہ نہیں۔ بنیادی بات اس اصول کا قائم ہونا ہے کہ داستان اپنی فطرت ہی میں بڑھنے اور پھیلنے کی صفت رکھتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان کا رجحان مذہبی افسانے یا اسطور سے ہٹ کر تاریخی اور تاریخی مطلع میں داخل ہونے کا ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ اوپر جن روایات سے بحث کی گئی، ان میں سے آخری دو روایتیں داستان کی ابتدا کو تاریخی زمانے (Historical Time) میں لے آتی ہیں۔ یہاں پیغمبر اسلام یا ان کے عمین شریفین (حضرات عباس و حمزہ) کے براہ راست تذکرے کے ذریعہ داستان کو تقدس عطا کرنے کی کوشش کے بجائے کسی عباسی خلیفہ کا ذکر ہے کہ اول اول یہ قصہ اس خلیفہ کو سنایا گیا جب وہ بیمار تھا۔ اس خلیفہ کا بھی نام مذکور نہیں کیا گیا، چہ جائے کہ ایسی کوئی بات کہی جاتی جس میں اہل بیت اطہار یا

اصحاب کبار پیمبر پر کسی طعن وتعریض یا دشنام دہی کا ذکر ہوتا۔ اس طرح، داستان کا افسانہ مذہبی ابتدا سے نا مذہبی ابتدا کی طرف سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے، اور خود بخود بڑھتے رہنے کی صفت کے باعث داستان، جو پہلے ''اتنی سی بات'' کے مصداق تھی، اب پورا ''افسانہ'' بنتی ہوئی نظر آتی ہے اور خود اس کے بارے میں کئی افسانے بنتے جاتے ہیں۔

اسطور سے تاریخ کی طرف سفر کا رجحان جو ہمیں اوپر کی روایتوں میں نظر آتا ہے، دراصل مذہب سے نا مذہب کی طرف سفر کا رجحان ہے۔ روایت اور اسطور میں عقیدے اور عقیدت کی گنجائش تاریخ سے زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کی پہلی مطبوعہ روایت (خلیل علی اشک) میں کوئی مذہبی حوالہ نہیں۔ اس کے برخلاف ساری تاکید نا مذہبی روایت اور تاریخ پر ہے:

> مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے، انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور ملک قلعہ گیری اور ملک گیری کے، خاص باد شاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصے کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک ایک داستان حضور میں سناتے تھے، انعام واکرام پاتے تھے۔
>
> (اشک، صفحہ ۲)

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ کسی مذہبی حوالے کی جگہ الف لیلہ کا ذرا سا اشارہ البتہ موجود ہے (ہر رات کو ایک داستان بادشاہ کو سنائی جاتی تھی)۔ یعنی داستان اب واضح طور پر تاریخ اور فن داستان گوئی کے منطقے میں داخل ہو گئی ہے۔ یہی صورت حال غالب لکھنوی کے یہاں بھی ہے:

> بہ سبب اس کے کہ اس داستان میں چار چیزیں ہیں، رزم، بزم، طلسم، عیاری، اس واسطے مترجم نے فارسی کی چودہ جلدوں کا ترجمہ کر کے چار جلدیں کیں... اور واضح ہو کہ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود کے وقت سے ہے۔ اور داستاں سرائے [شیریں] مقال نے وجہ تصنیف اس قصے کی یہ تحریر کی ہے کہ اس کے سننے سے ہر طرح کی خلقت کا طر[یق] معلوم ہوتا ہے اور منصوبہ لڑائی اور قلعہ ستانی وملک گیری کا خیال

دل میں آتا ہے اس لئے ہمیشہ بادشاہ...کو سناتے تھے۔

(غالب لکھنوی، صفحہ ۲ تا ۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے کچھ باتیں مزید معلوم ہوتی ہیں اور یہ سب حسب معمول داستان کی طوالت کا بیج اپنے اندر رکھتی ہیں: داستان میں رزم اور بزم ہی نہیں ہے۔ طلسم اور عیاری بھی اس کے عناصر اربعہ میں شامل ہے۔ پھر یہ کہ اس سے محض لڑائی اور قلعہ ستانی کی باتیں (رزم) نہیں معلوم ہوتیں، اس سے ہر طرح کے لوگوں کا حال احوال بھی ملتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس حال احوال کو رزم، بزم، طلسم، اور عیاری کے علاوہ کوئی شے سمجھنا چاہیئے، کیونکہ "ہر طرح کے لوگوں کا احوال" اقوام وملل اور دیار وامصار کے بارے میں معلومات قسم کی چیز ہے، صرف قصہ کہانی اور رزم و بزم نہیں۔ آخری بات یہ کہ اب یہ تخصیص نہیں کہ سلطان محمود ہی کو یہ داستان سنائی جاتی تھی۔ اب کا سامع کوئی بھی بادشاہ تھا، یعنی یہ داستان کسی ایک بادشاہ یا دربار کے ساتھ مقید تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں داستان کی ممکنہ طوالت کی ضامن ہیں۔

امیر حمزہ کی شہادت کے بارے میں بھی روایتوں کی کثرت اور آپسی اختلاف اسی بات کا اشارہ ہے کہ داستان میں حسب دلخواہ ترمیم واضافہ کا امکان ہے، بس یہ شرط ہے کہ کسی بنیادی وقوعے میں تبدیلی نہ کی جائے۔ مثلاً، یہاں بنیادی وقوعہ یہ ہے کہ امیر حمزہ کی شہادت پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ہمراہی میں دوران جنگ ہوئی۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس واقعے کی کتنی روایتیں داستان (مختصر) میں موجود ہیں۔

<u>قصہ حمزہ، مخطوطہ مرتبہ جعفر شعار (۱۹۶۹)، صفحہ ۵۴۵ تا ۵۴۶</u>

نخست لندھور بن سعدان شاہ شہادت یافت۔ بعد آں، از آن سعد بن عمر، دیاران دیگر افتاد۔ بجز عمر امیہ ہمہ یاران حمزہ شہادت یافتند۔ و تیرے در شتالنگ امیر المومنین حمزہ (رضی اللہ عنہ) رسید کہ بیکار شد۔ و سنگ فلاخن در دہن مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسید و دندان مبارک مجروح شد۔ عمر امیہ زمری رضی اللہ عنہ کہ ایں اخبار بر حمزہ رسانید، امیر بانگ بر اشقر زد قصد بر ہرمز نوشیرواں، تیغ دو دستی می زد و کفار را می کشت و می راند، بیت۔

دودستی...

...وادن خصم نامد دریغ

برایں نمط تیغ زناں نزدیک مراتب ہرمز نوشیرواں رسید، نعرہ زد۔ وچوں نعرۂ حمزہ ہرمز نوشیرواں شنید، چتر و مراتب رہا کرد، راہ گریز پیش گرفت۔ چوں ہرمز نوشیرواں پشت داد، کفار در ہزیمت شدند۔ امیر دنبال تیغ زناں می رفت و دگر کس گرد امیر نہ بود۔ تا چہار کروہ قصد کرد۔ بعد، عناں بکشید و مظفر و منصور باز گشت۔ سوے شہر مکہ می آمد، و آں ہند مادر بور ہند راہ امیر گرفت، زیر [مسیر] پنہام شد...او بگذشت، چناں ...کرد کہ ہر چہار دست و پاے اشقر دیوزاد قلم شدند۔ امیر در زمین افتاد، خواست تا بجنبد۔ ہند تیغ در گردن امیر چناں زد کہ سر از تن امیر جدا شد۔ پس شکم پارہ کرد، جگر بکشید، بخورد۔ بعد تن امیر را ہفتاد پرکالہ کرد۔ بعد شکستن پشیماں شد۔ در دل گذرانید کہ حمزہ را پریاں یارند... مرا زندہ نخواہد گذاشت، بہ ایں باشد کہ پنہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بگیرم۔ پس ہند [پیش] پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم آمد و از کشتن امیر اقرار کرد۔ پیغامبر علیہ السلام گفت، اے عورت مرا بنماے کہ آں شیر مرد را کجا کشتہ ای۔ ہند راہبر شد۔ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم [را] بر سر امیر آورد۔ رسول علیہ السلام از اسب فرود آمد، ہفتاد بار بر جنازہ نماز بگزارد۔ دریں دو روایت است۔ جز یک بار نماز درست نیست، وچوں بود کہ رسول علیہ السلام ہفتاد بار کرد بر ہر پرکالۂ بہ نزانگشت پاے...ونماز جنازۂ امیر بگذارد۔ دریں ہم دو روایت است۔ یکے آنکہ چوں ہفتاد پرکالہ کردہ بود... بر ہر پرکالہ...دیگر آنکہ چوں اول کرت پیغامبر علیہ السلام از نماز فارغ شدند، مہتر جبرئیل با فوج ملائک برسید۔ گفت، یا رسول اللہ، ما بہ ثواب جنازہ نہ رسیدیم۔ پس رسول علیہ السلام اذن کرد، مہتر جبرئیل علیہ السلام امامت کرد۔ چوں فارغ شد، میکائیل علیہ السلام با فوج خود رسید...و اسرافیل علیہ السلام با فوج خود بیامد۔ بدیں نمط ہفتاد مرتبہ... ہاے خود براے نماز جنازۂ امیر المومنین (رضی اللہ

عنہ)... بردند۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم پرسیدند، یا رسول اللہ، ایں چہ بود کہ بہ نر انگشت... بسیار بود، پاے داشتن... برنر انگشت ایستاد...

ترجمہ:

سب سے پہلے لندھور بن سعدان شاہ نے شہادت پائی۔ اس کے بعد سعد بن عمر کے لوگوں نے، اور پھر دوسرے یار اور ساتھی بھی کشتہ ہو کر گرے۔ بجز عمر امیہ، سارے یاران حمزہ کو شہادت نصیب ہوئی۔ اور امیر المومنین حمزہ (رضی اللہ عنہ) کی ایڑی پر ایک تیر لگا کہ اس کے باعث [ان کا پاؤں] بیکار ہو گیا۔ اور گوپھن سے پھینکا ہوا ایک پتھر دہن مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آیا اور آپ کا دندان مبارک مجروح ہوا۔ عمر امیہ ٔ زمری رضی اللہ عنہ نے جب یہ خبر امیر حمزہ تک پہنچائی تو امیر نے اشقر کو پکارا اور ہرمز بن نوشیرواں پر حملہ کیا۔ امیر تیغ دو دستی چلاتے اور کفار کو کشتہ کرتے، بیت۔

دو دستی... [تلوار چلاتے] اور

...دشمن [کو زک] دینے میں بالکل تکلف نہ کرتے

اس طرح تیغ زناں وہ ہرمز بن نوشیرواں کے علموں تک پہنچ گئے اور نعرہ کیا۔ اور جب ہرمز بن نوشیرواں نے نعرہ ٔ حمزہ سنا تو اس نے چتر اور علم چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی۔ جب ہرمز بن نوشیرواں نے پیٹھ دکھائی تو کفار ہزیمت میں آ گئے۔ امیر ان کے پیچھے پیچھے تیغ زناں چلے اور امیر کے ساتھ کوئی شخص دیگر نہ تھا۔ چار کوس تک وہ حملہ کناں چلے گئے، پھر انھوں نے عنان کھینچی اور مظفر و منصور ہو کر واپس لوٹے۔ وہ شہر مکہ کی طرف جاتے تھے کہ پور ہندی کی ماں ہند بھی امیر کے راستے پر چلی اور ایک پل یا اچھی سی جگہ کے نیچے چھپ گئی... امیر [وہاں سے] گذرے تو ہند نے ایسا... کیا کہ اشقر دیوزاد کے چاروں ہاتھ پاؤں قلم ہو گئے۔ امیر زمین پر آ رہے۔ انھوں نے چاہا کہ اٹھیں۔ لیکن ہند نے امیر پر ایک تلوار ایسی ماری کہ ان کا سر تن سے جدا ہو

گیا۔ اس کے بعد ہند نے آپ کا شکم چیرا، جگر نکالا، اور اسے کھا گئی۔ اس کے بعد اس نے امیر کے بدن کے ستر ٹکڑے کر ڈالے۔ اس شکست و ریخت کے بعد وہ شرمندہ ہوئی اور اس کے دل میں خیال آیا کہ پریزاداں حمزہ کے دوست ہیں، وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اچھا یہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں چلی جاؤں۔ پس ہند پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئی اور اس نے امیر کے قتل کا اقرار کیا۔ پیغامبر علیہ السلام نے فرمایا، اے عورت مجھے دکھا کہ تو نے اس شیر مرد کو کس جگہ قتل کیا تھا۔ ہند نے راہبری کی اور پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لاشۂ امیر پر لائی۔ رسول علیہ السلام گھوڑے سے اترے اور ستر بار [امیر کی] نماز جنازہ ادا فرمائی۔ اس میں دو روایتیں ہیں۔ ایک سے زیادہ بار نماز جنازہ درست نہیں، تو پھر یہ کیونکر ہوا کہ رسول علیہ السلام نے ستر بار نماز پڑھی۔ [ان کے بدن کے] ہر ٹکڑے پر، پاؤں کے انگوٹھے کے بل [کھڑے ہو کر]...نماز جنازۂ امیر پڑھی۔ اور اس میں بھی دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ [ہند نے] ستر ٹکڑے کر دیئے تھے...ہر ٹکڑے پر.... دوسری [روایت] یہ کہ جب پیغامبر علیہ السلام پہلی بار نماز سے فارغ ہوئے تو مہتر جبرئیل با فوج ملائک پہنچے اور بولے، یا رسول اللہ، ہم نماز جنازہ کے ثواب سے محروم رہے۔ پس رسول علیہ السلام نے اجازت دی، مہتر جبرئیل علیہ السلام نے امامت کی۔ جب وہ فارغ ہوئے، میکائیل علیہ السلام اپنی فوج کے ساتھ پہنچے ...اور اسرافیل علیہ السلام اپنی فوج کے ساتھ پہنچے۔ اس طرح ستر بار... [گروہ] بھی برائے نماز جنازۂ امیر المومنین (رضی اللہ عنہ)...لائے گئے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے پوچھا، یا رسول اللہ، یہ کیا بات تھی کہ [آپ] پاؤں کے انگوٹھے....بہت کثیر تھے، [پاؤں رکھنے] کی جگہ [نہ تھی]... پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑے ہوئے...

## رموز حمزہ (ممبئی ۱۹۰۹)، صفحہ ۲۳۷

لندھور بن سعدان بہ شہادت رسید۔ امیر حمزہ قصد علمدار کرد و علمدار را بکشت۔ واز چپ و راست اسپ می دوانید و ہیچ کس را زہرۂ آں نبود کہ در برابر او آید۔ ہندہ چوں چناں دید، پیش وحشی آمد و گفت، اگر تو حمزہ را ہلاک کنی تو را از مال دنیا مستغنی گردانم۔ برو، بر سر راہ حمزہ کمیں کن کہ او بحرب مشغول است۔ وحشی در میان کشتگاں پنہاں شد و حمزہ جنگ کناں و نعرہ زناں خود را نزدیک لشکر ہرمز رسانید۔ چوں ہرمز آواز نعرۂ امیر شنید، روے بگریز نہاد۔ امیر در عقب ایشاں تا چہار فرسنگ رفتہ، عناں بکشید و مراجعت نمود۔ چوں بہ لشکرگاہ رسید، ناگاہ وحشی از کمیں گاہ برآمدہ، حربۂ بر سینۂ امیر زد کہ حربہ کارگر آمد، و از اسپ در افتاد و جاں بحق تسلیم نمود۔ وحشی ہند را بقتل امیر حمزہ بشارت داد۔ ہند بر سر امیر آمد و شکم او را بشگافت و جگر او را بیروں آوردہ بخورد۔ و گوش و بینی او را ببرید۔۔ و رسول خدا... بر امیر نماز گذارد۔ و ہر شہیدے را کہ می آوردند، پیش حمزہ می نہادند و نماز گذاردند، تا ہفتاد نوبت بر حمزہ نماز گذارد۔ و فرمود تا شہدا را بجامہ ہاے خون آلود بدون غسل دفن کردند۔ و مجموع شہدا ہفتاد تن بود۔ در آخر روز بمدینہ مراجعت کردند۔

ترجمہ:

لندھور بن سعدان نے شہادت پائی۔ امیر حمزہ نے علمدار پر حملہ کیا اور علمدار کو قتل کر دیا۔ وہ دائیں اور بائیں اپنے گھوڑے کو دوڑاتے اور کسی کو ہمت نہ تھی کہ ان کے برابر آئے۔ ہندہ نے جب یہ حال دیکھا تو وہ وحشی کے پاس گئی اور بولی، اگر تو حمزہ کو ہلاک کردے تو تجھے مال دنیا سے مستغنی کردوں گی۔ جا، اور حمزہ کے راستے میں گھات لگا کہ وہ ابھی مشغول حرب ہیں۔ وحشی نے خود کو کشتگاں کے درمیان پنہاں کرلیا۔ ادھر امیر حمزہ نے جنگ کرتے اور نعرہ لگاتے ہوئے خود کو لشکر ہرمز کے نزدیک

پہنچایا۔ ہرمز نے آوازۂ نعرۂ امیر سنا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ امیران کے پیچھے چار فرسنگ تک گئے۔ پھر انھوں نے عنان کھینچی اور مراجعت کی۔ جب وہ لشکر گاہ کو پہنچے، ناگاہ وحشی کمیں گاہ سے باہر آیا اور اس نے ایک چھوٹا خنجر سینۂ امیر پر مارا۔ خنجر کار گر ہوا، امیر گھوڑے سے گرے اور جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ وحشی نے ہند کو قتل امیر حمزہ کی خبر پہنچائی۔ ہند نے امیر کی لاش پر آ کر ان کا شکم چاک کیا اور ان کا جگر نکال کر کھا گئی۔ اور ان کے کان ناک کاٹ ڈالے ...رسول خداؐ... نے امیر پر نماز جنازہ پڑھی۔ اور جس جس شہید کو لایا جاتا، اسے امیر حمزہ کے آگے رکھ دیا جاتا اور پھر نماز جنازہ پڑھی جاتی۔ [اس طرح] امیر حمزہ پر ستر بار نماز پڑھی گئی۔ اور [آپؐ] نے فرمایا کہ شہدا کو جامہ ہائے خون آلود کے ساتھ بدون غسل دفن کر دیا جائے۔ اور سب ملا کر ستر شہدا تھے۔ جب دن تمام ہوا تو آپؐ نے مدینہ کو مراجعت فرمائی۔

"زبدۃ الرموز" ناقص الآخر ہے، لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں امیر حمزہ کی شہادت کے بارے میں کیا درج ہے۔ لیکن خلیل علی اشک کے یہاں ہم حسب ذیل بیان دیکھتے ہیں:

<u>خلیل علی اشک (۱۸۰۱)، جلد چہارم، صفحہ ۸۳ تا ۸۴:</u>

امیر، مع یاران اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تلوار نکال کر کافروں پر جا پڑے۔ اور لشکر اسلام کا کفار میں ایسا تھا جیسے آٹے میں نمک۔ اس پر بھی بے شمار کافروں کو مارا۔ لیکن لندھور شہید ہوا اور سعد بن عمر اور عمر معدی اور دوسرے یاروں نے شہادت پائی۔ اور حضرت کی ایڑی میں تیر لگے۔ پس وہیں حمزہ گھوڑا اٹھا کر ہرمز کے نزدیک لے گئے تو ہرمز چھتر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تب سب کافر بھی بھاگے۔ پھر امیر نے دنبالہ کافروں کا کیا۔ چار کوس مار کر کافروں کے مردوں کے پہاڑ بنا دیے اور فتح و نصرت رہی۔ امیر نے باگ گھوڑے کی پھیری۔ تب ایک عورت [جس] کا ہندہ نام تھا، امیر کو دیکھ کر ایک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپ رہی۔ جونہی امیر اس پتھر کے برابر آئے، تب اس

ملعونہ نے ایک تلوار ایسی ماری کہ اشقر کے چاروں ہاتھ پاؤں قلم ہوئے اور امیر زمین پر گر پڑے اور اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تب اس مردار نے اجل کے زور سے ایسی تلوار ماری کہ آفتاب عجم وعرب غروب ہوا۔ یعنی امیر شہید ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پھر امیر کا شکم مبارک شق کیا اور جگر نکال کر کھا گئی۔ پھر حضرتؐ کے حضور میں آئی اور امیر کی شہادت کی خبر دے کر بولی میں نے شہید کیا ہے۔ حضرت نے فرمایا وہ میرا شیر کہاں ہے؟ تب حضرت کو لے چلی اور امیر کی جائے شہادت دکھائی۔ تب امیر کے ٹکڑے کرنے کو حضرت نے فرمایا اور ستر مرتبہ نماز جنازہ کی پڑھی۔ اور پاؤں کے انگوٹھے پر کھڑے رہ کر نماز ادا کی۔ اس میں دو روایت ہیں۔ حضرت نے ہر ایک ٹکڑے پر ایک نماز پڑھی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اول مہتر جبرئیل اپنی فوج ملائک ...اور کہا، یارسول اللہ ہم نے حمزہ کی نماز جنازہ کا ثواب نہیں پایا ہے۔ تب حضرت نے امامت کی اور جبرئیل نے مع ملائکہ اقتدا کیا۔ بدستور ستر ملک مقرب بدرگاہ کبریائی [نے] نماز کے واسطے عرض کی۔ حضرت نے ستر بار امامت کر کے جنازے کی نماز پڑھائی، پھر جنازے کو دفن کیا۔ بعدہ اصحابوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا سبب ہے جو آپ نے نماز انگوٹھوں پر کھڑے رہ کر ادا کی۔ حضرت نے فرمایا کہ ہجوم سے فرشتوں کے جگہ باقی نہ رہی تھی، اس واسطے انگوٹھوں پر کھڑے رہ کر نماز پڑھی۔

ان تین بیانات میں کئی کئی روایتیں ہیں اور ہر روایت ایک دوسری سے کچھ مختلف ہے اور کچھ مشابہ ہے۔ داستان (طویل) تک آتے آتے کچھ نئی باتیں شامل ہوگئی ہیں اور کچھ باتیں حذف ہوگئی ہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو حذف ہوا ہے وہ سب مذہبی نوعیت کا ہے۔ یعنی داستان کا سفر حسب معمول طوالت کی طرف بھی ہے اور نامذہبیت کی طرف بھی۔ "لعل نامہ" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ میں نے تمام کم ضروری عبارتیں نکال دی ہیں:

لعل نامہ، جلد دوم (۱۸۹۷)، صفحہ ۱۰۰۳ تا ۱۰۰۵

امیر شب بھر قلعۂ احد میں مقیم رہے۔ صبح کو نماز سحر سے فراغت حاصل کر کے جانب

تخت گاہ روانہ ہوئے۔اس وقت صاحب قران کے ہمراہ جمیعت کثیر تھی...جنگ مغلوبہ ہونے لگی۔صاحب قران سب کے آگے بڑھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ قریب علمدار فوج کے پہنچے۔امیر نے علم فوج کو قلم کیا۔علمدار نے تلوار کا وار کیا۔ صاحب قران نے ...علمدار لشکر کو قتل کیا...جس طرف جس کو بن پڑا اس طرف بھاگا...لشکر بالکل منتشر ہو گیا۔مگر صاحبقران زماں تنہا بادشاہ احد کے تعاقب میں چلے اور بادشاہ احد شہر پناہ کی طرف فرار ہوا... بادشاہ احد نے دیکھا کہ سلطان ویلم اور بادشاہ بدخشاں اور چند سلاطین فوجیں ہمراہ لئے ہوئے آتے ہیں... بادشاہ نے... بہ آواز بلند کہا، اے حمزہ خبردار! سلطان احد پر دست درازی نہ کرنا ورنہ ایک عرب کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔امیر نے فرمایا، اے ویلمی، کیا بیہودہ گوئی کرتا ہے... بادشاہ ویلم کی فوج نے صاحبقران زماں کو چاروں طرف سے گھیرا۔فوج ویلمی کے ہمراہ اور سلاطین کفار کی بھی فوجیں ٹوٹ پڑیں۔صاحبقران زماں اس وقت تنہا تھے، شیرانہ و نہنگانہ وغا کرنے لگے۔دم بھر میں لاشوں کے انبار لگا دیئے۔مگر کہاں لشکر بے انتہا ،کہاں [صاحبقراں] یکہ وتنہا، چاروں طرف سے وار پڑنے لگے۔کفار نے تیروں کا مینھ برسا دیا۔صاحبقران زماں انتہا سے زیادہ زخمدار ہوئے، مرکب پر ٹھہرا نہ گیا۔ہاتھوں نے دستگیری نہ کی۔امیر عالی وقار پشت زین سے بروے زمین تشریف لائے۔گھٹنوں کے بھل زمین پر بیٹھ کے تلوار ہلانے لگے۔کفار اس وقت بھی ہیبت صاحبقراں سے نزدیک امیر نہ آتے تھے۔دور سے وار کرتے تھے،کوئی تیر لگاتا تھا کوئی نیزہ مارتا۔آخر صاحبقراں میں اتنی طاقت بھی باقی نہ رہی۔امیر نامدار زمین پر گرے۔ کفار نے جو دیکھا کہ صاحبقراں میں بالکل دم باقی نہیں ہے، چاہا کہ اب ظلم سے ہاتھ اٹھائیں۔مگر بادشاہ احد نے کہا کہ ابھی حمزہ کو مردہ تصور نہ کرو۔جب تک اس کی لاش باقی رہے گی، مجھے اسی بات کا خوف رہے گا کہ ایسا نہ ہو حمزہ کے تن میں روح آ جائے اور یہ اٹھ کے مجھے قتل کرے۔میری رائے یہ ہے کہ لاش پر حمزہ کی گھوڑے دوڑا

دو کہ لاشہ بالکل پامال ہو جائے اور ہر جز و بدن علیحدہ علیحدہ ہو جائے۔ لشکری اس کے تابع فرمان تھے، گھوڑے لاش صاحبقراں پر دوڑا دیئے۔ لاشۂ امیر پائمال ہوا۔ بادشاہ احد نے اس پر بھی اکتفا نہ کی۔ کئی بار گھوڑوں کو چکر دیئے اور ہر بار یہ کہتا تھا کہ کوسوں چکر لگاؤ کہ ریشہ ریشہ صاحبقراں کے جسم کا اس کے عزیزوں کو نہ ملے کہ وہ لوگ لاش کو دفن کریں گے۔ یہ مجھے منظور نہیں۔ سواروں نے ویسا ہی کیا کہ کوسوں کے چکر لگائیے۔ لاش امیر پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ لاش کہاں ہے... مگر امیر ثانی اور سرداران عرب جو تعاقب میں کفار کے گئے، ان لوگوں کو قتل بھی کیا، بعض لوگ بھاگ کے نکل بھی گئے۔ امیر ثانی کے ساتھ خواجہ عمرو نامدار اور خواجہ عمرو ثانی بھی تھے.... امیر ثانی نے کہا، صاحبقران نامدار تعاقب بادشاہ میں گئے ہیں۔ خواجہ بہت گھبرائے، امیر ثانی سے کہا کہ پہلے صاحبقران زماں کو تلاش کرو پھر اور طرف چلو... یہ ذکر تھا کہ دامن گرد شگافتہ ہوا۔ سب نے دیکھا کہ بادشاہ احد گھوڑے پر سوار اور کئی بادشاہ اس کے ہمراہ، عقب میں لشکر بے شمار، سب رواروی کرتے ہوئے آتے ہیں... امیر ثانی نے کہا، اب اس کو یہاں پر روکنا ضرور ہے۔ خواجہ نے کہا، آپ لوگ اس سے جنگ کریں، مگر میں تلاش صاحبقراں میں جاؤں گا... اتنی دیر میں لشکر قریب پہنچا۔ امیر ثانی نے نعرہ کیا، اے کافران غدار، خبردار! آگے نہ بڑھنا۔ اگر آگے جاؤ گے تو زک اٹھاؤ گے۔ بادشاہ احد نے کہا، اے عرب، تو کون ہے جو اس طرح پھر رہا ہے۔ تجھے لازم ہے کہ اپنے سر پر خاک اڑا، گریبان چاک کر۔ صاحبقراں کو میں نے قتل کیا۔ امیر ثانی نے جو یہ بات سنی، ہوش بجا نہ رہے۔ تلوار کھینچ کر بادشاہ احد پر جا پڑے... صاحب دفتر نے لکھا ہے کہ چار روز کامل تلوار چلی۔ پانچویں دن کفار میں چند کس باقی رہے اور امیر ثانی بادشاہ احد کے قریب پہنچے۔ اس نے چاہا کہ گھوڑے کو بھگا کے نکل جائے، مگر امیر نے تلوار اس کے سر پر لگائی کہ سر اس کا جدا ہوا۔ بادشاہ ویلم نے جو دیکھا، اس نے امیر ثانی پر وار کیا۔ امیر کے سر پر تلوار پڑی، ماتھے تک اتر

آئی۔ مگر اس حال میں بھی امیر نے اس زخم کا بھی خیال نہ کیا، بادشاہ ویلم کا بھی سر جدا کیا۔ اور جس قدر بادشاہ، سلطان احد کی مدد کو آئے تھے، امیر ثانی نے سب کے سر قلم کئے۔ ان لوگوں کا قتل ہونا تھا کہ جو چند کس ان سب کے ہمراہیوں سے باقی رہ گئے تھے، انھوں نے امان طلبی کی۔ صاحبقران ثانی نے تلوار روکی۔ یہ سب لوگ حاضر ہوئے، اپنی عفو تقصیر چاہی۔ امیر نے سب کو کلمہ تعلیم فرمایا۔ جنگ سے فراغت پائی تو امیر اس درجہ زخمدار تھے کہ گھوڑے سے نہ اتر سکے۔ سرداران عرب نے بغلوں میں ہاتھ دے کر اتارا۔ صاحبقران زماں نے کلمۂ طیبہ زبان پر جاری کیا۔ روح قالب سے پرواز کر گئی...خواجہ تلاش لاشۂ صاحبقراں میں روانہ ہوئے۔ چاروں طرف لاش کو تلاش کیا، کہیں پتہ نہ پایا۔ خواجہ کو سخت تردد ہوا۔ ایک ایک کوچے کو چار چار بار دیکھا مگر لاش کا پتہ نہ ملا۔ جب خواجہ دن بھر کی رہروی سے مضمحل ہوئے تو ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگے اور درگاہ کبریا میں عرض کہ اے کریم کارساز، جب تو نے صاحبقراں کو مجھ سے چھڑایا ہے تو مجھے کیوں زندہ رکھا؟ اب زندگی سے دل میرا اسیر ہو چکا، مگر اے کریم، انجام بخیر کرنا...اس شب کو بھی خواجہ نے شب بھر لاشے کو تلاش کیا۔ دوسرے روز سرداروں نے کہا، خواجہ، امیر ثانی کا لاشہ ابھی تک یوں ہی رکھا ہے۔ اس کے کفن دفن کی کچھ فکر کرنا چاہیئے۔ خواجہ نے جواب دیا، آپ لوگ جا کر اس کی فکر کریں۔ میں جب تک لاشہ صاحب قراں کا نہ پاؤں گا اس وقت تک مجھے قرار نہ آئے گا۔ سب سردار بھی مجبور ہوئے۔ خواجہ نے اس روز بھی دن بھر لاش تلاش کی۔ جب کہیں لاشے کا پتہ نہ ملا، خواجہ سر شام پھر ایک جگہ پر تھک کر گر پڑے۔ اس وقت خواجہ نے بصد الحاح وزاری عرض کی کہ اے کریم کارساز، اے رب بے نیاز، لاشہ صاحبقراں کا مل جائے۔ ابھی تک امیر بے گور و کفن ہوں گے۔ خواجہ یہ دعا کرتے کرتے سو گئے۔ دیکھا ایک بزرگوار سامنے کھڑے ہوئے فرماتے ہیں، اے خواجہ اٹھو۔ جس قدر ریزے تمھیں اس وقت صحرا میں روشن نظر آئیں، اب سب کو چن کر یکجا کرو۔ کفار نے

لاش صاحبقراں کو اس درجہ پامال سم اسپاں کیا ہے کہ لاش صاحبقراں کی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ تمھیں لازم ہے کہ لاش صاحبقراں بصد احتیاط دفن کرو کہ تم پر حق نمک صاحبقراں ہے۔ خواجہ کی جو آنکھ کھلی، دیکھا صحرا میں ہزار ہا چراغ روشن ہے۔ خواجہ نے قریب جا کے دیکھا، گوشت کے ریشے پائے۔ خواجہ نے جمع کئے، ایک چادر میں جمع کر کے خواجہ وہاں سے واپس آئے، جہاں لاشہ امیر ثانی کا پڑا تھا۔ خواجہ نے وہاں پہنچ کے دونوں لاشوں کو تیمم کرا کے دفن کرا دیا۔

اس بات سے قطع نظر، کہ بیانیہ کی قوت کے اعتبار سے ''قصۂ حمزہ'' اور ''لعل نامہ'' دونوں میں اپنی اپنی طرح کا زور اور روانی ہے، جو بات فی الحال ہماری توجہ کی مستحق ہے، وہ یہ ہے کہ ''لعل نامہ'' کی روایت میں کئی باتیں پرانی روایتوں سے مختلف ہیں اور ''لعل نامہ'' کا بیان گذشتہ تمام بیانات کے مقابلے میں طویل اور تفصیلات بھرا ہوا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ''لعل نامہ'' سے مذہبی عناصر بالکل غائب ہیں، حتیٰ کہ رسول مقبول تک کا ذکر نہیں، کہ جنھیں اب تک کی تمام داستانیں کسی نہ کسی شکل میں قصے کا مبدأ قرار دیتی تھیں۔ یا کم سے کم اتنا تو تھا کہ امیر حمزہ کی مذہبی حیثیت، یعنی ان کی شہادت عظمیٰ، اس شہادت کا مقبول بارگاہ نبوی اور بارگاہ الٰہی ہونا، امیر حمزہ کے بلند مراتب، رسول کریم اور امیر حمزہ کی قرابت قریبہ، ان باتوں کا ذکر داستان کی تمام روایتوں میں موجود تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ''قصۂ حمزہ'' میں مذہبیت یہاں تک ہے کہ ایک شرعی اور فقہی مسئلہ بھی زیر بحث لایا گیا تھا کہ ایک ہی شخص کی نماز جنازہ ایک سے زیادہ بار جائز ہے کہ نہیں؟ ''قصۂ حمزہ'' اور ''رموز حمزہ'' میں تو امیر حمزہ کی شہادت کو قرآن کی دو مختلف آیتوں کی شان نزول بھی بتایا گیا ہے (میں نے وہ عبارتیں چھوڑ دی ہیں)۔ لیکن ''لعل نامہ'' امیر حمزہ کی محض شہادت کا ذکر ہے، اور یہ شہادت بھی اکیلی نہیں، حمزۂ ثانی بھی اس اعزاز میں امیر حمزہ کے شریک ہیں۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا، دو روایتوں میں حضرت علی کو بھی امیر حمزہ کے شانہ بہ شانہ جنگ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ داستان (طویل) کی مندرجہ بالا روایت میں سے کسی ایسی بات کا ذکر نہیں جو اس میں بیان کردہ وقوعوں کو مذہب کے میدان سے متعلق کر سکے۔ یعنی داستان اب مذہب کے منطقے سے نکل کر ''تاریخ'' کے منطقے میں داخل ہو گئی ہے۔ گویا اب جا کر داستان پوری طرح افسانہ بن گئی ہے۔

میلکم لائنز اپنی کتاب The Arabian Epic میں لکھتا ہے:

اس غرض سے، کہ ہم دنیا کو معنی یا معانی کے تانے بانے کی بافت کے طور پر دیکھ سکیں، دنیا کو کسی نہ کسی نہج کی حقیقت سے منسلک کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس کی ایک سادہ سی سطح یہ ہے کہ کسی دنیاوی [افسانوی] ہیئت کو تاریخی حقیقت کے طور پر پیش کیا جائے۔ لاطینی مورخ لوشن (Lucian) نے اس خیال کی توسیع کا مذاق اپنی "تاریخ" میں یہ کہہ کر اڑایا تھا کہ اس کے بیان میں سچ صرف وہی ہے جہاں میں یہ کہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بہر حال جو بھی ہو، تمام دنیا میں فکشنوں نے یہ روایت قائم رکھی ہے کہ ہم "سچے حقائق" کا علم لہراتے ہیں۔ اس طرح بوودئیں کی قدیم فرانسیسی داستان Li Romans de Bouduin de Sebourc میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ "بالکل سچے وقائع ہیں جو تحریر سے ثابت ہیں۔" اسی طرح، شہسوار اور راج ہنس کی منظوم داستان Le Chanson du Chevalier au Cygne میں دعویٰ ہے کہ یہ "حرف بہ حرف سچ" ہے... عربی داستان سیـرت ذاة الهمة میں تو داستان کے تمام اہم کرداروں کو داستان گو سے باتیں کرتے دکھایا گیا ہے... اسی طرح، زمان کے حساب سے دیکھیں تو ایک کے سوا تمام داستانوں کا ربط کسی تاریخی یا نیم تاریخی ماضی کے کسی قابل شناخت زمانے سے ہوتا ہے۔ اور یہ زمانہ داستان کی اپنی داخلی توقیت کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے اور یہ توقیت اکثر خیالی ہی ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے اب یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ داستان کس طرح "تاریخ" کا روپ دھار کر پوری طرح "افسانہ" بنتی ہے۔ اگر واقعات اور وقوعوں کے اعتبار سے دیکھیں تو داستان (طویل) کی حد سے حد چار جلدیں ایسی ہیں جن میں داستان (مختصر) کے اصل حالات، یعنی امیر حمزہ کی پیدائش سے لے کر "احد کی جنگ" میں ان کی شہادت کا حال بیان ہوا ہے۔ وہ جلدیں حسب ذیل ہیں:

نوشیرواں نامہ، اول

ہومان نامہ

## نوشیرواں نامہ، دوم

### ہرمز نامہ

اب یہ داستان (مختصر) میں پوشیدہ امکانات ہی تھے جن کی بنا پر داستان (مختصر) کی ایک چھوٹی سی جلد کی یہ چار ضخیم جلدیں بنیں، اور پھر بیالیس جلدیں اور وجود میں آئیں۔ اس کتاب کی اگلی جلد میں ہم داستان امیر حمزہ (طویل) کی دنیا میں پھیلے ہوئے ''افسانوں''، ''واقعات'' اور ''حقیقی کرداروں'' کا کچھ حال دیکھیں گے ☆☆

تمام شد

الحمد للہ وصلوٰۃ وسلام علیٰ رسولہ الکریم کہ مدینۃ العلمش گردانید
تمام شد ایں تصنیف نظیف تالیف بندۂ ضعیف موسوم بہ شمس الرحمٰن فاروقی
کہ جلد دومین کتاب کاں را ''ساحری، شاہی، صاحبقرانی: داستان امیر حمزہ
کا مطالعہ'' می نامند در ماہ ستمبر ۲۰۰۶ مطابق سنہ ۱۴۲۷ من ہجرت
حضرت رسالت علیہ السلام باعتنا و اہتمام قومی کونسل براے فروغ اردو
زبان، حکومت ہند، نئی دہلی حلیہ انطباع یافت من نوشتم صرف کردم روز
گار من نہ مانم ایں بماند یادگار انتہیٰ ۱۲

# اشاریۂ اسمائے رجال

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

## شعر شور انگیز (جلد اوّل)

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 650

قیمت: -/238 روپے

## شعر شور انگیز (جلد دوم)

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 517

قیمت: -/130 روپے

## شعر شور انگیز (جلد سوم)

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 697

قیمت: -/64 روپے

## شعر شور انگیز (جلد چہارم)

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 810

قیمت: -/170 روپے

## عروض آہنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 340

قیمت: -/144 روپے

## تنقیدی افکار

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 347

قیمت: -/148 روپے


ISBN: 81-7587-185-7 (Set)
81-7587-186-5


**National Council for Promotion of Urdu Language**
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066